

مضامین شری

نظم و ڈراما

۱۷۹
۲۵۲
۲۵۱

مضامین شری جلد ۱



نظم و ڈراما

شبِ وصل

Checked
1087
RARE BOOK
NOT TO BE ISSUED

کسی کا ہاے وہ راتوں کو چھپ کے یوں آنا
چھڑے چڑھائے ہوئے پائے اٹھائے ہوئے

دردِ جگر کچھ آج تھا ہے زخمی دل کو چین پڑا ہے
شوقِ بیابان بھولا ہوا ہے برسوں بعد زمانہ پھرا ہے

خوب ہوا آرام تو پایا
بچینی سے چین تو آیا

لو شبِ وصل کی شام آہونچی نکلے گی خوب سی حسرت دل کی
غم جاتا ہے عشرت آئی چمکا تارہ قسمت جاگی

آج وہ اپنے قابو میں ہوں گے
ہم بھی اُنکے پہلو میں ہوں گے

جس پر قربان دہ رات اب ہے جس کے صدقے آج وہ شب ہے
میاں میں اُن کی تیغِ غضب ہے وصل نصیب اب اپنا لقب ہے

واہ رے وہ اور اُن کی چاہت

واہ رے میں اور میری قسمت

چرخ پہ کچھ کچھ اندھیرا چھایا کوئی کوئی ستارہ چمکا
چڑیاں ڈھونڈ رہی ہیں سیرا کوہِ دن نے اک شور مچایا

دیکھتے ہی دو وقتوں کو ملتے

موت کے خواہاں اٹھ اٹھ بیٹھے

شور ہوا ہر سمت اذان کا برہمنوں نے سنگھ بجا یا
بجئے لگا ہر دیر میں گھنٹا نیچر شام کا ہر جا چمکا

دوسری جانب دنیا لپٹی

پیرِ فلک نے کروٹ بدلی

دیکھو باغ پہ کیا جو بن ہے پھولوں پر بے ساختہ پن ہے

سارا گلشن جیسے دھن ہے کس زوروں پہ بہا چپن ہے

کیا اٹھلاتی باد صبا ہے

جلد کہیں آجائیں خدا ہے

آئی رات ہوئی اندھیاری چرخ پہ تاروں نے کی گھکاری

کیسی رات مبارک ساری اچھی اچھی پیاری پیاری

اب پازیب بڑھاتے ہوں گے

تھوڑی دیر میں آتے ہوں گے

سامان وصل کا کر لیں آؤ شیشے مے سے بھر لیں لاؤ

بہرگز کچھ جلد نہ گاؤ اچھی پلنگڑی لا کے بچھاؤ

اٹھو جا کر شمع جلا دو

سارے کمرے میں پھول بھیا دو

جامِ صراحی بنا کاری سُرخ نے کی سُہانی پیاری

عطر آگین ہے بادِ بہاری اُن کے آنے کی ہے تیاری

غم غلط آج ہمارا ہوگا

پہلو میں کوئی سپا را ہوگا
 ہو گیا سارا وصل کا ساں کمر ہے اب جیسے گلستان
 آئی مسہری ہر جانان جسے نگین ہو گئے شادان
 ساری رخ کدورت ہوگی
 آج کسی سے صحبت ہوگی
 اب تو ہو چکی شمع بھی روشن آتے ہیں جھونکے ہوا کے سن سن
 پڑ گئی ہر دروازے پہ چلن ہر شے پر ہے بستا جو بن
 جن پر قرباں اپنا جگر ہے
 کب آئیں گے کس کو خبر ہے
 سامان آنے کا کرتے ہونگے بیٹھے خوب نکھرتے ہونگے
 گیسو رخ پہ سنورتے ہونگے سینے پہ جو بن ابھرتے ہونگے
 پیارا سپا را نکھڑا ہوگا
 چہرہ ساند کا ٹکڑا ہوگا
 کرتے ہوں گے نکھلی چوٹی نکلی ہوگی بانگ غضب کی
 لگتی ہوگی ہاتھوں میں مہندی تلے ہوں گے دانوں میں سی
 کا جل آنکھوں سے ہوگا نمایاں
 جھپٹتے ہوں گے اٹھے پہ انشاں
 کیونکر دل کی کلفت جائے دیر ہوئی اب تک نہیں آئے
 دل کو کوئی کب تک پہلائے کوئی صبر کہاں سے لائے
 آخر ان کے آتے کی حسد بھی
 اپنے رنج اٹھانے کی حد بھی
 کب تک بیٹیں کب تک نہیں کب تک متہ اشکوں سے دھوئیں
 کب تک اپنے جی کو کھوئیں کدوٹ بدلیں اور نہ سوئیں
 دیکھیں کب ہو آتا ان کا
 بھول گئے وہ آنا کیسا!

ہائیں روز بنا جاتے تھے قسمیں روز ہی کھا جاتے تھے
فقر میں روز لگا جاتے تھے کس دن وعدے پر آ جاتے تھے

جھوٹم نہ کیوں پہچان گئے ہم!

ہائے غضب کیوں مان گئے ہم!

ٹھہرو کس کی آہٹ پائی چپ ہوا چلنے کی چاپ سی پائی
دیکھو! کس نے جھلک ٹکھلائی سنبھلو! دُور ہوئی تنہائی

اُٹھو! دوڑ کے بوسہ لے لو

دوڑ و اجان کو صدقے کر دو

آئے اور کس ناز سے آئے سہمے گھبرائے شرمائے

سینہ اُبھارے سر کو جھکائے بیچی نظر آ پھل ٹکائے

مرے میں ہم کو بٹھیا پا کر

جھپ گئے دروازے پر آ کر

رُک رُک کے وہ کسی کا آنا چپکے چپکے پاؤں اُٹھانا

بیٹھے ہی پاؤں کا بنانا پاؤں پاؤں میں شرمانا

ہائے غضب ڈھانا وہ کسی کا

دُور سرک جانا وہ کسی کا

مان نہ جانا اُن کا ستم ہے ہم کو وصل میں بھی اک غم ہے

ہر دم میرے سر کی قسم ہے ضد سے اُن کی ناک میں دم ہے

ہائے وہ بھولی بھولی باتیں

ہائے چلے جانے کی گھاتیں

روٹھ گئے لو بیٹھے بیٹھے! کون خطا تھی جس پر گڑے

آخر کچھ کہیے تو ہم سے لیٹ رہے کیون منہ کو چھپائے

کہنا وہ اُن کا جب کچھ چھیڑو

”ننید ہے آئی ہم سے نہ ہو“

خود ہی دل میں رحم بھی آیا دھاتی د و پٹہ منہ سے ہٹا یا

پیارا پیارا ہاتھ اٹھایا ڈال کے گردن میں فرمایا
 کیوں پھر ایسی بات کہو گے؟
 وصل کا پھر ارماں کرو گے؟
 ناراضی میں کہتے تھے چل مٹ خود ہی راضی ہو گئے جھٹ پٹ
 پھیر کے میری جانب کروٹ کرنے لگے پھر آپ لگا روٹ
 آپ ہی روٹھے آپ ہی بولے
 کیا سمجھ کر گئے بن کر بیولے
 آپس میں پھر وصل کی ٹھانی چادر لیٹ کے سر سے تانی
 چل گئی اپنی سحر بانی دل کی بات انہوں نے مانی
 بوسے لگے گلے تل جُل کے
 لپٹے خوب ہی باہم گھل کے
 عید کسی عاشق کے گھر ہے اڑنا سا غریب سا غریب
 شرم سے انکی نیچی نظر ہے کوئی نہ آجائے یہ ڈر ہے
 لطف اٹھے کیا کیا صحبت کے
 بولے خوب مزے و صلت کے
 ٹھنڈی ہوا کے جھونکے آئے طائر اپنے جھونچک سے نکلے
 مسجد والے وضو کو اٹھے روئے والوں نے آنسو پونچھے
 کوئی سو گیا روتے روتے
 چونک پڑے وہ سوتے سوتے
 دن سے توپ کی آواز آئی چلنے والوں کی آہٹ پائی
 مرغ سحر نے بانگ لگائی تارون پر بھی زردی چھائی
 صبح ہوئی کروٹ ہی بدلتے
 اٹھ بیٹھے وہ آنکھوں کو ملتے
 صبح کو وہ شرابی صورت پھیلکی پھیلکی رُخ کی رنگت
 پھولوں کی وہ کم کم گھمت بڑھ گئی ہے کچھ اور نزاکت

کرتے ہیں دل ہی دل میں غصا
 کچھ بھی کہتے ہیں نہیں ۱۲
 چرخ چہ تیار دن کی فحش
 شمع کی ماپو سائے صورت
 ہا سے ہماری یاس اور حسرت
 اور کسی کو جاننے کی محبت
 ناز سے اُن کا اُٹھ کر جانا
 چہ آنے کی قسمیں کھانا
 چین پٹے کا دل کو کچھ نکلا
 دیکھ رہے ہیں صبحِ محشر
 بیٹھے ہیں حیران - مضطرب شدہ
 جان آئی ہے اب تو لبوں پر
 بیٹھے شہر ہو کیوں پر حسرت
 جل بھی بجھتے شمع کی صورت

شبِ غم

درو دل - زخمِ جگر - کلفتِ غم - داغِ فراق

کون آفت ہے جو اپنی شبِ بھران میں نہیں؟

صد مہِ فرقت ہو شرابا ہے غم کا سامان آنکھوں میں بندھا ہے
 رات اندھیری کالی بلا ہے ہو کا عالم رنجِ فزا ہے
 درد کے مارے رو رو دینا

آفتِ جاں ہے سانس کا لینا
 رہ رہ کر وہ دل کا اُچھلنا
 آپ ہی آپ کلجے کا کٹنا
 اشک کے دریا کا وہ ابلنا
 رخ کی رنگت کا وہ بدلنا
 جب نہ کسی کے ہاتھ پر سہا ہو

دل کو دبا کر رات بسر ہو
 پائ کسی کا وعدہ کرنا ٹھنڈی ٹھنڈی آہیں بھرنا
 پر خواہی سے چونک کے ڈرنا مرگ کی خواہش اور نہ مرنا
 یاس ہمیشہ شکل دکھائے
 موت کہاں کی؟ غم نہ آئے
 صبر و تحمل کا مہ آئین درد و اہم سے دل بہلائیں
 بستر غم پر لوٹ لگائیں خود جاگیں اور سب کو جگائیں
 رات کا کتنا امرا ہم ہو
 درد گھٹے تو دونا غم ہو
 ہے بے کس کا ناز اٹھائیں؟ کس کو قصہ بھر سنائیں؟
 کس سے اپنا جی بہلائیں؟ کون خفا ہے؟ کس کو سنا لیں
 مدد ہے مدد ہے غم پر غم ہیں
 ہاے شب غم ہے اور ہم ہیں
 نیند کسی کو آتی ہے کیونکر؟ قابو کیونکر پاتے ہیں دل پر؟
 رہتے ہیں کیونکر حیران مضطرب؟ جیتے ہیں کیونکر ہجر میں شب بھر؟
 تھک گئے کرتے کرتے نالا
 ہم کو تو غم نے مار ہی ڈالا
 کس دم یہ اندھاری ہو گئی؟ دیکھیے تو کس وقت پھٹے گی؟
 کیونکر آنکھیں دل کی گھٹنے کی؟ کیونکر ساری رات گھٹنے کی؟
 گزرے گی یوں ہی سر کو دھنتے
 مارے گئے تھکے جنتے
 یہ سناٹا اور تنہائی وحشت اور تاریکی چھائی
 کائے کھاتی ہے انگنائی وہ کیوں آئیں؟ قسم دکھائی
 جان بھی ہے اب دشمن اپنی
 لب تک آئی اور نہ نکلی

کون ایسا ہے جو اُن تک جاؤ؟ سارا یہاں کا حال سُنائے؟
جائے اپر کیا جا کے بنائے؟ کوئی دھیان میں بھی تو لائے؟

روؤ۔ پیٹو۔ اُن کی بلا سے

مر بھی جاؤ اُن کی بلا سے

ٹھہرو! کئے بچتے ہیں لوگو؟ شام ابھی بے گنتے کیا ہو؟
ناحق حجت کرتے ہو تم تو تم سے مطلب بکتے ہیں گن لو

بکھنوں پر آفت آئے

اتنی دیر میں آٹھ بجائے

لیٹے چین نہ بیٹھے رحمت دل میں اُکھن۔ منہ پر حسرت

وحشت اور تنہائی آفت بتیابی اور یاس کی حالت

آنکھوں میں آنسو بھر بھرا لانا

رورودینا۔ مرمربانا

لوگوں نے ہوگی سونے کی ٹھانی ہوگی سر سے دولاٹی تانی

لیٹے سنتے ہوں گے کہانی ہوتی ہوگی قصہ خوانی

کیسا کسی کی جان کا جانا؟

اُن کو اپنے دل بھلاتا

اُنکو دو دہان کے سونا دُنیا بھر سے بے غم ہونا

کیسا رونا۔ کیسا دھونا؟ کیسا ہوتا ہے جان کا کھونا؟

پھولوں کے اوپر لیٹے ہوں گے

سیبھی نندیں لیتے ہوں گے

ہر اک اپنے یار کو پائے پیاری باتوں میں دل بہلائے

چین سے اپنے ساتھ سلائے دلبر کو سینے سے لگائے

رنگ چھڑائے خوب مسمی کا

چوم لے منہ ہر بار کسی کا

سب لوگ اربابِ دل کا نکالیں پیارے گلوں میں باہیں ڈالیں

باتوں میں روٹھوں کو نہ لیں بادہ کشی میں غم کو نہ لیں
 ہم یوں کروٹ بدلیں شب بھر
 اس پہلو پر اس پہلو پر
 دیکھے کوئی کلکتے کا جلسا شام نمائش گاہ کا جلو
 پتلی کمر اور نکلیں چہرا لیے بالوں سے جھونکے کھانا
 چلتا رنگ کر آنکھیں جھپکائے
 اور وہ سادی وضع بنائے
 سبزہ رنگوں کا جھوم کے چلنا تنکے پاؤں سے دل کا ملنا
 تاک میں وہ تاروں کا ملنا عینک وہ ہر بار سنبھلنا
 کہیے کس کا کس کا قصتا
 کیجیے کس کس کا کاشکوا
 چرخ پہ بسنے والے تاروا پیارے پیارے چکنے والوا
 آنکھیں پھاڑے دیکھتے کیا ہو دم بھر کو تو سو لینے دو؟
 حاصل! ایک جلے کو جھلانا
 سینے کے اندر آگ لگانا
 لذت وصل اٹھانے والوا دل پر قابو پانے والوا
 کوئے یار کے جانے والوا گھر میں کسی کو بلانے والوا
 دل میں تمہارے اور بھنی ہے
 کیا جاؤ جو ہم پہ بنی ہے
 شہر خموشاں والوا بولو خواب پریشاں والوا بولو
 گنج شہیداں والوا جاگو گور غریباں والوا اٹھو
 جب تک ہجر کے سدھے ہیں گے
 تم کو بھی آج نہ سونے دیں گے
 اٹھ بیٹھو سونے والوا آنکھیں کھولو محلے والوا
 اونٹننے والے پہرے والوا لے دیوار کے نیچے والوا

ہم تو غم کے مارے روئیں
 آپ مرے سے لیٹ کے سوئیں
 صبر کہاں تک بندہ پرور؟ آخر کتنا جبر ہو دل پر؟
 نکلا کھجبا آنکھوں سے بہ کر اس جینے سے مرنا بہتر۔
 ٹوٹی قبروں میں سونے والو!
 اپنا صدقہ ہم کو بلالو!
 آئی کتنی رات خدایا اب تک کچھ نہیں سُننے میں آیا؟
 گتوں نے شور لگایے مجایا ہر جانب سناٹا چھایا
 چپ ہیں سارے محلے ٹولے
 برقتنداز بھی آج نہ بولے
 کب تک نہیں اور رلاؤں مسجد والوں کو آؤ جگائیں
 منبر والوں کو جل کے اٹھائیں شیخ کے سر پر شور مچائیں
 پڑھ کے تہجد سونے والو!
 وقت ازاں ہے جلدی اٹھو
 میکشوا! وقت صبحی آیا مہ و شو باجا و نہانے لگنا
 برہمنوا! دیر کا رستا طائر و بانگ چھوڑو لیرا
 واعظو! رات فنا ہوتی ہے
 دیکھو نماز قسنا ہوتی ہے
 پچھلی رات کے سونے والو! صبح وطن کے کھونے والو!
 کلفتِ غم کے دھونے والو! اوسیدار نہ ہونے والو!
 آنکھیں ملے اٹھ اٹھ بیٹھو
 کھوٹی ہوتی ہے منزل جاگو
 آگئے اپنی جان سے ماری خاک میں ل گئی رحمت ساری
 آج کی رات ہے ہمیر بھاری لے لو قسم جو پلک ہو ماری
 کیسی محبت؟ کیا مرنا؟

کیا وصل کا ارماں کرنا؟
 لاکھ طح سے دل بہلایا چین کسی عنوان نہ آیا
 سب کو اٹھا یا سب کو جگایا کوئی ہمد ہائے نہ آیا
 تھی اک شمع جو مال شرم پر
 آٹھ آٹھ آنسو روئی شب بھر

زمانہ اور اسلام

فلک کے حسین۔ اور نیچے پیارے چراغ جہاں۔ اور دبیر عمارے
 انیس نکلے جو ہوئیں آفت کے مارے گل فطرت۔ اور بزم انجم کے نالے
 نہیں اب کیس جلوہ گر ہیں؟ ہو کیا؟
 کہاں چھپ رہے یک بیک؟ ہو کیا کیا؟
 چکنے لگی بجلی۔ برلی گھر آئی اُٹھی آندھی اور تازہ آفت ہے لائی
 تیامت کی ہے تیرگی یاں تو چھائی نہیں ہاتھ کو ہاتھ دیتا دکھائی
 ہے اس خوف سے کیا خاموش جنگل!
 کہ دم بھر میں پڑ جائے گی ایک بلبل
 کوئی کس طرف جائے؟ کیونکر چلے؟ اکیلا میں! یہ کیسی! یہ بیاہاں
 یہ سناٹا! یہ تیرگی! ایسا طوفان! یہ شور و خوش! اور یہ آفت کا سماں
 جدھر دیکھ لو ہوتی ہے ایک وحشت
 کہاں ہائے افسوس لائی ہے قسمت!
 اُلجھتا ہے ہر جا پہ کانٹوں میں دامن ہے اُن جھاڑیوں میں درندوں کا مسکن
 ادھر وحشت میں سخت ہے خوف بہزن مگر میں اسی سمت چلتا ہوں قصداً
 یہ مکمل مسافر چلا خوف کھاتا
 چراغ ایک تھا جس طرف ٹٹماتا

Checked
1987

چلا دو قدم تھا لگی ایک ٹھوکر گر ازور سے لڑکھڑاکے نہیں پر
 گرا اور گرتے ہی سر کو پکڑ کر یہ چلتا پایا لے واپس میرے مقدر
 نہیں مجھ میں طاقت کہ یہ رنج اٹھاؤں
 جو چٹکا ر مشکل ہو تو مر ہی جاؤں
 نہ ہے یاں مددگار کوئی نہ یاور نہ غمخوار کوئی - نہ مونس - نہ رہبر
 نظر آتی ہے یاس ہر ہر قدم پر بنایا ہے حسرت نے دلگیر و مضطر
 نہیں ہے! اے موت تجھ کو بھی کچھ مہیاں
 نہیں تنگ ہے آسمان دور ہے یاں!
 کہاں جاؤں؟ - اتنا ہی تھا کہنے پایا کہ آواز آئی کہیں سے قصارا
 مددگار کوئی کیا؟ تھا یہ کیسا دھماکا؟ جو کوئی ہو آواز دے - میں ہوں اس جا
 غریبوں کا حسرت زدوں کا ہوں یاور
 جو آوارہ ہیں انکا ہمدرد و رہبر
 کہ اہا کیا پہلے تھاں صحرا پھر اک آہ کی - اور رو رو کے بولا
 کسی نے دیا غم میں مجھ کو دلاسا کہ دکھلایا اسید کا پیا را چہرا؟
 پڑا ہوں یہاں لے فرشتے خدا کے
 جو طاقت ہو خود لوں قدم تیرے آگے
 نہ یہ پوچھ - میں کون ہوں؟ نام کیا ہے؟ یہ کافی ہے - اک درد کا بتلا ہے
 مصیبت زدہ دشت میں آپھنسا ہے وطن - ہاے مشوق تک سے جدا ہے
 خدا جانے کس درد کا یہ بیاں تھا!
 کہ غم کا سماں دشت بھرے عیاں تھا!
 وہ آندھی کے تپے کا وقت اور اندھیرا! لے اور جڑے اُن درختوں کا نقشہ
 وہ سناٹا! وہ آسمان کا لاکا لاکا! درندوں کا شور اور وہ باد لگ کر جانا
 کی ہر طرف تیرگی سے وہ راہیں!
 یہ عالم! اور اُس میں مسافر کی آہیں!
 وہ نا طاقتی - نا توانی سے بے دم! ٹھکی - اور گری وہ صداسلی پر غم!

نکلنا وہ آواز کا ضعف سے کم! وہ حسرت کا لہجہ! مصیبت کا عالم!

وہ اب اب کے پھولی ہوئی سانس لیتا!

وہ رک رک کے کچھ دل کو تسکین دیتا!

صد آئی۔ کس طرح میں تم تک آؤں؟ جہاں تم ہو وہاں کا نشان بھی تو پاؤں!

تھی بولو کیونکر قدم میں اٹھاؤں؟ کہا۔ ہاے! میں کیا کہوں؟ کیا بتاؤں!

نشان یاں کا خود بھی تو پہچانتا ہوں!

کوئی چیز بھی یاں کی تو جانتا ہوں!

وہ گم گشتہ رہ ہوں۔ کہ اپنا بتا بھی نہیں جانتا۔ آگئی اس میں آندھی

مسافر نے گویا پوری کئی تھی مگر اُس کی پر غم صد ا پھر نہ آئی

لبند اب ہوا شور و اشجار را

کہ مشکل تھا اپنی بھی آواز سنتا

جو یہ حال دیکھا تو وہ مرد میدان خدا ترس باہمت اور اہل ایمان

چلا ہو کے اُس پاشکستہ کا جو یاں پھر اودشت میں ہر طرف سخت خیراں

پتا تا کہ اُس غم رسیدہ کا پائے

بنے جس طرح جائے اور ڈھونڈ لائے

سماں ایک آفت کا اس دم بندھا ہے جہاں بھر پہ ظلمت کا پردہ پڑا ہے

ہر اک نخل و حشت سے چلا رہا ہے غرض دیکھو جس سمت خشر بپا ہے

برابر گر جتا ہے رہ رہ کے با دل

اور اس شور سے گونج اٹھتا ہے جنگل

بسیروں پہ چڑیاں سیٹھ بن بازو گھنی جھاڑیوں میں دھکتے ہیں آہو

درختوں میں جا جا کے چھپتے بن ملکینو اُلجھتے ہی جاتے ہیں ظلمت کے گیسو

درختوں کے پتے ہیں کیا کھڑکھڑاتے!

زمیں پر ہیں کیا ہنسنے پھٹ پھٹ کے آتے!

درختوں پہ آتے ہیں جھونکے ہوا کے تھپڑے ہوا دے رہی ہے ہلاکے

سبھی بس میں ہیں یا و حشت فزا کے ستم ہر طرف ہو رہے ہیں صبا کے

نہیں وحشیوں کی بھی آواز آتی
خبر کون لے اس دم آفت زدوں کی
یہ سب کچھ تھا۔ لیکن وہ مردِ مسلمان
پھر اٹھو کرین کھاتا اُفتان و خیراں
بہت جا پہنچ گئے اُسکے داماں
ہوے پار تلوں سے خارِ میناں
غرض جس جگہ وہ مصیبت کا مارا
پڑا تھا۔ گیا اور جا کے پکارا

کہ: "اے مبتلائے غم و رنج و آفت! ادھر ہاتھ لا۔ اب نہیں اتنی بہلت
کہ ٹھہریں یہاں۔ دیکھ طوفاں کی حالت جو پانی! بھی پڑنے لگا ہو گی وقت
ذرا صبر کر۔ اور چل میرے گھر میں

غنیمت سمجھ اُس کو ایسے سفر میں۔
اگرچہ پڑا تھا وہ بے تاب و بیدم مگر سسکیاں بھر کے۔ با چشمِ پر غم
اُٹھا۔ اور کہا: "لے مرے دل کے مرہم! فرشتہ ہے تو؟ یا کہ از نسلِ آدم؟
تھی تیری ہی جرأت۔ اس آفت میں آنا۔
غریبوں کو حسرت زدوں کو بچانا"

یہ بولا جو انفرادی۔ اے سینہ بریاں! میں ہوں انکِ غریب اور بے مایہ انسان
کیا مجھ کو دُنیا نے از حد پریشاں کہوں کیا۔ (مگر دیکھ کر زورِ طوفاں)
لگا کہتے: "کمدوں گا پھر حال سارا
چل اب۔ ورنہ ہو جائے گا حشرِ بپا"

پھر اک دوسرے کو پکڑ کے وہ باہم نظر کرتے ہر سمت ڈر ڈر کے پیہم
غم و رنج بہلاتے باتوں میں ہر دم چلے دیکھتے ابر و طوفاں کا عالم
بہت ٹھوکریں کھا کے پہنچے وہاں پر

جہاں اُس انیس غریباں کا تھا گھر
جو دیکھا۔ تو اک ٹوٹا پھوٹا مسکن تھا گذشتہ ترقی کا اُجڑا نشان تھا
سماں ہر طرف حسرتوں کا عیاں تھا ہر اک اینٹ کے دل سے اُتھا دھولوں
سٹی جاہ و حشمت تھی دیوار و درے
نکلتی تھیں ابیں چھتوں کے جگر سے

جو افر دئے کھولا دروازہ بڑھ کر پھر اُس غمزدہ کی طرف پھیر کر سر
کہا۔ اے جفاکش۔ دل نگار مضطر اب آرام کرو گھڑی حل کے اندر۔

ادا کر کے شکریہ وہ زار و بے دل

ہوا اپنے ہمدرد کے گھر میں داخل

وہ ہمدرد صحرانیش بھی پھر آیا چراغ آندھی سے چھو گیا تھا۔ جلا یا
چٹائی پہ مہاں کو اپنے بٹھایا پھر اک چھٹیرالا کے آگے بچھایا

غریبی کا کھانا۔ نکتف سے لا کر

کہا۔ لے جو دے تجھ کو میرا مقدر

وہ شہروں کے کھانے۔ وہ کھانے کی لذت وہ نعمت کے خواں۔ وہ غذاؤ کی کثرت
وہ باغوں کے میوے۔ وہ ہر روز خوشی وہ دولت کے کھیل۔ اور وہ سامانِ رحمت

نہیں اُن میں سے کوئی شے یاں مہیا

جو حاصل ہے۔ ہے سب یہ خیر کا ہدیا

رہے اب نہیں یاں نکتف کے ساما کبھی خوب رونق پہ تھا یہ بیا یاں
تروتازہ سرسبز تھا اک گلستاں رہا کرتے ہر دم تھے میل غزلخواں

ہمارے ان درختوں پہ تھی کس بلا کی!

نظر آتی تھی ان سے قدرت خدا کی!

یہ ٹیلے جنہیں جبل کی اکثر چمک کر دکھاتی ہے ایسے مکانات جن پر:
گماں قصر حنیت کا ہوتا تھا اکثر عمارت نہ دنیا میں تھی جسے بہتر

کبھی تھے یہی فقر و اے عالم

کبھی تھے یہی مریح شام و دہلیم

ہر اک علم کے بالکمال۔ اور کیا ہر اک فن کے شائق اور اُسکے جیا
ہنرمند۔ صنّاع۔ ادیب اور اطبا۔ ہندس۔ منجم۔ حکیم اور دانا

جو ان مرد۔ جنگ آزما۔ مرمیداں

سبھی قسم کے لوگ آباد تھے یاں

”کمالوں سے دنیا میں تھی انکی عزت و در کھتے تھے تموار سے اپنی وقعت

کیا ایک کچھ ایسی ٹپسی اُن آفت نہ وہ لوگ تھے۔ اور نہ وہ اُن کی شہرت
جو کچھ رہ گئے تھے وہ نکلے پریشیاں

کہ افلاس کا پوچھیں غیروں سے دریاں

اب اک میں ہوں حسرتِ غم کا ساں ہے مصیبت ہے آفت ہے، ٹوٹا مکاں ہے۔
ہر اک سمت سے صورتِ غم عیاں ہے۔ زمانہ عد وہے۔ خلاف آسماں ہے۔

کہاں تک کہوں؟ جانے دو۔ فائدہ کیا؟

تنا دل کرو۔ نام لے کر خدا کا۔

یہ کہہ کر گیا خود بھی بیٹھ۔ اور مل کر لگے کھانے وہ دونوں غلین و مضطر
کیا ایک خدا جانے کیا گزری دل پر؟ جھکا یا مسافر نے یکبارگی سر

نظر کی جو جھٹک کر۔ تو آنسو رواں تھے

جو غم دل میں محض تھے رخ سے عیاں تھے

نظر آئی جب یہاں کی یہ حالت رہی ضبط کی میزباں میں نہ طاقت
بڑے غور سے دیکھ کر اُسکی صورت بہت کھانکے ترس اور بہ آوازِ شفقت

یہ بولا کہ۔ "اے بخت برگشتہ مہماں!

بیاں حال کر۔ کون ہے؟ کیوں ہے حیراں؟

"نکالا کسی غم نے تجھ کو وطن سے؟ کہ کچھ رنج ہو سچا ہے چرخِ کُن سے؟
ہے آوارہ یا مفلسی کے محن سے؟ جھٹا یا کہ مشوقِ پیاں شکن سے؟

تبا۔ اس قدر کیوں ملول اور حزین ہے؟

ہے کیا رنج؟ کیوں سخت اندوہیں ہے؟

رہا پہلے چُب۔ پھر کھا ضبط کر کے "کہوں کیا؟ ہوتے ٹکڑے ٹکڑے جگر کے!
تاؤں میں گیا حال اپنے سفر کے جس میں پھرتا ہوں اک سیبر کے

زمانہ مجھے کہتے ہیں۔ بے نوا ہوں

نہیں ہاے ملتا جے ڈھونڈتا ہوں"

تعجب سے گھبرا کے ہمدرد بولا زمانہ! ہے یہ نامِ مشہور دنیا!
تھیں ہوا نہایت ہی حیرت کی ہے جا! نکلا تمہیں کیوں پڑا؟ کیا ہوا کیا؟

وہ تھا کون دلبر؟ کہاں تھا؟ کہاں ہے؟
 کہاں رہتا ہے؟ نام کیا؟ کیا نشاں ہے؟
 سوا لوں کا سنا تھا کیا۔ اک بلا تھا۔ رہا ضبط کا پھر نہ کہاں میں یاد را
 لگی شیشہ دل میں اک بھیس گویا بہت زور سے رویا اور روکے بولا
 بیاں کیا کروں ماجرا اپنے غم کا!
 کہوں حال کیا اپنے رنج و الم کا!
 کوئی گیارہ سو سال گزرے کہ میرا گزر ایک جا اتفاقاً ہوا تھا
 کہوں کس طرح ہائے عالم وہاں کا! عجب شہر تھا! اور عجب اُسکا نقشہ! ا
 خدائی کا سامان تھے وہاں فراہم
 عجب دھوم دھام اُس میں ہوتی تھی ہر دم
 عمارت عالی کی وہ شان داری وہ باغوں کی رونق۔ وہ باؤ بہاری
 ہرے پودھوں کے نیچے نہر جاری وہ اونچے محل انگی وہ استواری
 نظر میں مری پھرتا ہے وہ سماں اب
 لیگا وہ افسوس سماں کہاں اب؟
 تھی اُس شہر کے بیچ میں اک عمار بلند اور خوش وضع۔ با شان و شوکت
 جو اس اُڑتے تھے دیکھ کر اسکی عظمت دلوں پر اثر کرتی تھی اسکی عظمت
 تھا اُس قصر عالی کا گنبد شہر!
 اُڑا کرتا تھا جس کے اوپر پھر ہرا
 ملک تھے سب زیر فرمان اُسکے دہلتے شہنشاہ تھے اُسکے در سے
 جھکائے تھیں رقبہ میں سر اُسکے آگے مذاہب تھے جو دست بستہ کھڑے تھے
 ہوا بندھ گئی تھی زمین و زمان میں
 تھی اک دھاک سی بھی سارے جہاں میں
 وہ تخت عجم اور اقبال کسے وہ تہذیب یونان۔ اور تاج روما
 وہ اسپین اور اُسکے شاہوں کا رتبا ارجیٹ اور وہ دبیرہ قطیوں کا
 سب خاک میں مل گئے جب فلک پر

چکنے لگا اس پھر ہرے کا اختر
 وہ جھنڈا تھا جس قصیر سیاہ فلک
 بچھا اُس میں تھا ایک تخت نرین
 کھڑے دست بستہ تھے سب دست دین
 تھی اک نازنیں تخت پر نور افشاں
 پڑا ساری دنیا پہ تھا جس کا داماں
 غضب جس تھا اُس بُت دلربا کا
 تھا اُس نے تاباں سے اک عیب پیدا
 کھڑا آگے اقبال خدا دست بستہ
 جس پر تھا اک خوشنما آج رکھنا
 چلتے تھے حرف اُس میں ہیرے سے بھرا
 ترقی اسلام لکھا تھا اُس پر
 جو ہیں دیکھی وہ شکل وہ پیاری صورت
 کہوں کیا کہ کیا ہو گئی میری حالت
 رہی غلب کی تاب مجھ میں نہ جرات
 گوارا ہوئی پھر نہ اُس بت کی فرقت
 غلاموں میں اُسکے ہو امیں بھی داخل
 ہوا خواہوں میں ہو گیا اُسکے شامل
 رہا مدتوں میں غلام اُسکے در کا
 ہوا شوق پھر سیر کا دل میں پیدا
 لیا چھوڑ اُسے میں نے یورپ کا ترنا
 بہت روزوں دیکھا وہاں کا تماشا
 وہیں تھا کہ وہ نازنیں پاؤ آئی
 تلاش اُسکی اس دشت میں کھینچ لائی
 خدا جانے وہ قصر باغ اب کہاں ہے
 وہ صورت کہاں! وہ شکر لب کہاں ہے
 وہ عیش اور وہ اقبال کی شب کہاں ہے
 حلال آبرو و بدہر سب کہاں ہے
 خدا جانے وہ قصر ہے؟ یا نہیں ہے؟
 اگر ہے تو بیشک کہیں پر ہیں ہے
 یہ سن میزبان نے بس اک بیج ماری
 بکڑول کو کرنے لگا آہ و زاری
 ہوئی شکل پر اُسکی حسرت سی طاری
 کہا رو کے پھر تارے قسمت ہماری!
 مے دوست - وہ قصر عالی ہی ہے -
 وہ گلزار فرخندہ حالی ہی ہے!

گئے لوگ سب یاں سے ہو کر پریشان رہا میں ہوں بس اور یہ جاے ویراں
 یہ سن کر بہت رو یا وہ غم کا تھاں لے اٹھ کے پھر دو نون با چشم گریاں
 وہ دو نون اب اس دشت میں دور ہے ہیں
 تباہی کی گردا شکوں سے دھو رہے ہیں۔
 مسلمانو! افسوس۔ عبرت کی جا ہے زمانہ غم قوم میں مبتلا ہے
 تمہیں ڈھونڈھتا وہ بد روہ پھر ہے بڑی مشکوں سے لگایا تپا ہے
 بہت رو چلے رونے والے۔ اٹھو اب
 زمانہ جو کتنا ہے وہ ہی کرو اب

بلیک ورس یا نظم غیر مقفی

یہ تو ہم گذشتہ نمبر میں بتا چکے ہیں کہ آئندہ سے "دلگداز" کی توجہ نظم کی طرف بھی رہے گی۔ مگر وہی نظم جو معنی خیزی کی نشان رکھتی ہو۔ جس کی غرض محض تناسب الفاظ اور قافیہ پجائی نہ ہو۔ "دلگداز" کا یہ نمبر گذشتہ نمبر کے بعد اپنی طبعی مرتب کیا گیا کہ جادو بیان شعرے ملک کو طبع آزمائی کا موقع نہیں مل سکا۔ اور اسی وجہ سے ہم آئندہ کے لیے بھی یہی پہلا سبک "امید" قائم رکھتے ہیں۔ سردست ہم نظم کی ایک نئی قسم کی طرف توجہ کرتے ہیں جو انگریزی میں تو بکثرت موجود ہے مگر اردو میں بالکل نئی اور عجیب چیز نظر آئے گی۔ مشرقی شاعری میں روایت و قافیہ بہت ضروری اور لازمی خیال کیے گئے ہیں۔ مگر انگریزی میں ایک جداگانہ وضع کی نظم ایجاد کی گئی ہے جسے "بلیک ورس" کہتے ہیں۔ اردو میں اس کا نام اگر "نظم غیر مقفی" رکھا جائے تو شاید زیادہ مناسب ہوگا۔ اصل یہ ہے کہ قافیہ وغیرہ کی قدیم کلام کو محدود اور طبع آزمائی کے میدان کو نہایت ہی تنگ کر دیتی ہیں۔ اگر کوئی ڈراما یا مختلف لوگوں کی گفتگو نظم میں ادا کرنی ہو تو مجبور ہونا پڑتا ہے کہ ہر فقرہ یا ہر خیال جس طرح بنے ہر مصرع

یا ہر شعر میں ختم کر دیا جائے۔ ظاہر ہے کہ اس قید کے ساتھ کلام کا تسلسل قائم نہیں رہ سکتا۔ اس لیے کہ قافیہ سلسلہ کلام کو ہمیشہ قطع کر دیا کرتا ہے۔ اسی مجبوری سے انگریزی میں خامتہ ڈراما کے لیے یہ نظم غیر مقفی ایجاد کی گئی جو یہ شان دکھاتی ہے کہ ایک طرف تو کلام برابر موزون ہوتا چلا جاتا ہے اور دوسری طرف سلسلہ کلام یوں جاری رہتا ہے کہ اگر مصرع مصرع جدا کر کے نہ لکھیں تو معلوم ہو کہ گویا بے تکلفی سے شریں گفتگو ہو رہی ہے۔ صرف یہی چیز ہے اور یہی نظم ہے جس نے شیکسپیر اور دیگر شعراء یورپ کو شہرت کے دربار میں سب سے معزز جگہ دی ہے۔

بعض انگریزی دان نوجوانوں نے کئی مرتبہ اردو میں نظم غیر مقفی کے کہنے کی کوشش کی مگر کامیاب نہ ہو سکے۔ اور نا کامی کی وجہ یہ ہوئی کہ سوا قافیہ کی قید چھوڑ دینے کے انھوں نے اس نظم کی دوسری خوبیاں اور اصلی ضرورت دکھانے کی طرف توجہ نہیں کی۔ شاید اگر وہ کسی ڈراما یا گفتگو کو نظم کرتے اور کلام کی بے تکلفی و روانی کے قائم رکھنے کی کوشش کرتے تو ممکن نہ تھا کہ اہل سخن پسند نہ کرتے۔

لہذا ہم اب اس جانب توجہ کرتے ہیں اور بالکل اسی انگریزی شان سے ایک موزون ڈراما لکھنے کی بنیاد ڈالتے ہیں۔ اگر ملک نے توجہ کی اور اہل سخن نے پسند کیا تو پورے سین موزون کر دیے جائیں گے۔ ورنہ دو ہی تین سین موزون کرنے کے بعد یہ سلسلہ چھوڑ دیا جائے گا۔ اس وقت ہمارا مقصود صرف اس قدر ہے کہ بلنیک ورس یا نظم غیر مقفی کو اس کی اصلی شان میں دکھا دیں۔ تاکہ جن اہل سخن کو پسند آئے وہ ابھی ایسی ہی نظمیں لکھیں۔ او ہم سے زیادہ بے تکلفی۔ سادگی۔ اور کمالات شاعری دکھائیں۔

ہم اپنے قدردانوں اور لائق جادو نگاروں سے بھی درخواست کرتے ہیں کہ اپنی معزز راؤن سے ہمیں ضرور مطلع فرمائیں تاکہ اردو شاعری کی دنیا میں اس نظم کے مناسب ہوئے یا نہ ہوئے اور مقبولیت عام حاصل کر سکنے یا نہ کر سکنے کا اندازہ کیا جاسکے۔ اب ہم کمال ادب پبلک کے

دربارین یہ نئی نظم اور یہ عجیب عتسم کا ڈراما پیش کرتے ہیں۔

پہلا سین

آبنائے جبرالٹر کے جنوبی ساحل پر ملک مراکو کے قدیم شہر سبٹہ کا
شاہی قصر جو لب ساحل واقع ہے
اشخاص

شاہ جولین فرمان رواے سبٹہ - اُس کے درباری - مصر کا ایک
نوادہ مسیحی شخص - فلوزڈا جولین کی بیٹی - چوہدار -

سین

جولین اپنے قصر سے ایک جہاز کو آکے ٹھہرتے اور اُس سے مصر کے
ایک نوادہ مسیحی شخص کو اُترتے دیکھ کے اہل دربار سے باتیں کرتا ہے۔

جولین

کون ہے؟ کیوں آیا ہے؟ اور کیا ہوائی کی غرض؟
کس لیے آیا ہے؟ اور کس کا یہ سادہ جہاز؟
گو سمجھ میں کچھ نہیں آتا۔ مگر حیرت سی ہے۔
میں تو کہتا ہوں کہ حضرت کوئی عیسائی فقیر
مانگنے آیا ہے

ایک بار

لیکن وضع سائل کی نہیں

جولین

مصر یا قرطاجنہ کا کوئی سوداگر نہ ہو
شاید ایسا ہی ہو۔ لیکن جو ہو آئے دو بیباں
خود ہی حال اپنا بتا دے گا یہ میرے سامنے
(چوہدار آتا ہے)

دوسرا درباری

جولین

اجنبی سیاح اک اُترتا ہے ساحل پر حضور
آرزو ہے باریابی کی اُسے

چوہدار

لاؤ ابھی

جولین

(چوہدار جاتا ہے)

پہلا درباری
جولین

پہلا درباری (زمین چوم کے)

جولین

شخص

جولین

شخص

جولین

شخص

جولین

شخص

خوف یہ ہے کافروں کا کوئی گویندہ نہ ہو
اب تو جو جو بو میں لے آئے کی اجازت ہی لے
(ایک شخص سوداگروں کے لباس میں آئی)
آسمان پھرتا ہے جب تک اسے جب تک قناب
فوربساتا ہے اس تاریک سطح خاک پر۔
دیں اُس مصلوب بیٹے کا خدا کے حسن گھڑی
تک ہے غالب سارے اُن دینوں پر جو
ظلم کی تعلیم دیں۔ اے بادشاہ محسوس
اُس گھڑی تک تو رہے حامی سچی دین کا۔
خیر۔ یہ تمہید چھوڑو۔ اور بتاؤ تم کس
سے یہاں آئے ہو؟

اے حامی تثلیث و ملیک!
یہ غلام آتا ہے ارض مصر سے سیدھا ادھر
اور غرض آئے کی؟
پر وحشت خبر۔

کیسی خبر؟
جس سے سب مصری سچی ہیں پریشان و خرب
کیا خبر ہے وہ؟
کو کون کا عرض خلوت میں لے۔

(ذرا سوچ کے) خیر بہتر

(سب اہل دربار سے) اے مرے سردار و اہل جاؤ ذرا

(سب چلے جاتے ہیں)

(شخص سے) لو کہو وہ کیا خبر ہے؟

عرض یوں ہی لے حضور

اک نئی فوج عرب آتی ہے ملک شام سے

جو لین (لا پرواہی سے)

شخص

جو لین
شخص

جو لین
شخص
جو لین
شخص

(ہاتھ جوڑ کے)

”تا کہ سبطہ پر کرے حملہ

مجھے پروا نہیں

دو شکستیں دے چکا ہوں جس طرح موسیٰ کو میں
اور جس ذلت سے بھاگے اُسکے پودے جنگجو۔
ویسے ہی بھاگیں گے یہ شامی سپاہی بھی نہیں
میرے جاں بازوں کا دمداہ ہو گا زور و شور سے۔
اس میں کیا شک۔ لیکن اس فوج عرب کے آخری
حملے میں ہے عیانی کی غرض۔ یعنی کہ وہ
چاہتے ہیں زباں رک جاتی ہے)

کیا؟

نہیں جرات؟ اُسکے عرض کی۔
اُن کی بے شرمی کی نیت کو کوئی کیونکر کرے
ظاہر ایسے شاہ کے آگے؟
کہو بے خوف تم۔

جان کی گرواماں۔

تم کو اماں ہے۔

تو حضور

یہ غلام باوقایوں عرض کرتا ہے : عجز
تا جدارِ شام کے بھائی کا اک نامی غلام
مُنکے شہرہ شاہزادی فلورنڈا کے حسن
کا ہوا قیاب اس حد تک کہ لے کر فوج کو
اور اجازت لے کے آقا سے چلا ہے اس طرف
تا کہ گھیرے شہر سبطہ۔

عہدِ موسیٰ بن بغیر ولید بن عبد الملک خلیفہ اموی کا سپہ سالار۔ پہلا عربی فاتح
افریقہ۔ اور پہلا گورنر افریقہ۔

مضامین شری

۲۴

نظم و در

(عقہ ہے)

جولین

شخص

جولین

جولین

شخص

جولین

شخص

جولین

(پکارتا ہے)

چویدار
جولین

(خود بخود)

کیا مجال اسکی کہ پاس
بھی ہمارے اسکے۔

لیکن ادھر سے بھی حضور
فوج لے کر آئے گا ہوسکی ملک پر اسکی جب
ہوگی دشواری

نہیں پر دیا مجھے اسکی بھی کچھ
لیکن اس میں کیا تامل ہو کہ ان کے آنے سے
پشتر شہزادی زہرہ جس جہاں میں چلی
انڈس میں یا کسی ایسی جگہ جس جا عرب
جائزہ سکتے ہوں

تو اچھا بھیچوں گائیں اُسے
تصر میں رزین کے جس جا رہا کرتی ہیں سب
بیٹیاں اچھے امیروں کی
تو جلدی بھیجیے۔

شاید آپہنیں عرب
میں بھیجتا ہوں آج ہی
اور کچھ کہنا تو آپ تم کو نہیں

بس کچھ نہیں۔
جاؤ۔ اور جب تک ہوسط میں رہے ہمارے
(شخص آداب کر کے جاتا ہے۔)

کوئی ہے؟

حاضر۔

فلورنڈا کو لاؤ یاں ابھی
(خدا شکر جاتا ہے)
گرچہ ملکو فوٹ ان وحشی لوٹیروں کا نہیں۔

اور ہے اسید خاتون معظم سے کہ میں
پہلے ہی میدان میں دوڑنا شکست ان لوگوں کو
مصلحت لیکن جی معلوم ہوتی ہے کہ اب
میں سو رنڈا کو بھیجوں گا لگہ و گے قصر میں
(فلورنڈا کے ایکسا دگی سے گھری جاتی ہے)

فلورنڈا (ز میں چوم کے)
جولین

کیوں کیا ہو محکمو یا دے باوا جان؟
اے بی بی
جانتی ہے تو مجھے کیسی محبت ہے بڑی
اور بے تیرے نہیں ہر لطف جینے کا مرے
سب نے اپنی بیٹیوں کو قصر میں اسپن کے
بے تکلف بھیجا ہے لیکن مجھے ہرگز نہیں
یہ گوارا تھا کہ تجھ سی لاڈلی اور پاک دل
بی بی کو بھیجوں وہاں۔

فلورنڈا
جولین

کیوں؟
اس لیے اس ملک میں
ایک نامدب شخص کا قبضہ ہو تاج و تخت پر
اور تو ہے خاص شاہی نسل قوم کا تھ سے
جسکے گھر کا راورق بھی تھا کبھی ادنیٰ غلام
لیکن اب محبوبوں اسپر کہ تجھ کو بھیج دوں
جتنی جلدی ہو سکے اُسکے محل میں
کیا مجھے

فلورنڈا

عہ خاتون معظم سے مراد حضرت مریم ہیں
عہ ٹالڈو جے عربی میں طلیطلہ کہتے ہیں یہ شعر عربی سے پہلے اسپن کی نسخی سلطنت کا پای تخت تھا۔
اسپن کا پچھلا بھیجا تھا کہ قوم کا بادشاہ جسکے قدیم شاہی خاندان کو آج و تخت سے
محروم کر کے راورق نے سلطنت پر قبضہ کر لیا تھا۔

وہ بلاتا ہے؟

نہیں۔ لیکن مسلمانوں کی فوج
آتی ہے مشرق سے۔

آئے تھے کبھی پہلے بھی وہ
ہاں مگر پہلے وہ خواہاں فتح کے تھے اور اب
چاہتے ہیں تجھ کو لیجائیں مرے آغوش سے۔
دو شکستیں دے چکے ہیں آپ تو اب خوف کیا
ہے کہ یہ لونڈی جدا ہو آپ سے؟

صرف احتیاط
ورنہ تجھ کو یہ یقین ہے بھاگے گی فوج عرب
جیسے ہی حملہ کریں گے میرے نامی پہلوؤں
تو مجھے کیوں بھیجتے ہیں آپ واں؟

یہ خوف ہے

اک طرف بڑھتا ہوں میں اور دوسری جانب وہ
کر کے یورش تجھ کو لے جائیں نہ

زندہ؟ کیا مجال!

لاش میری جاے گی!

یہ بھی تو تجھ کو خوف ہے۔

اور اسی سے بھیجتا ہوں واں تجھے

لیکن وہاں

راہِ آوارق کا خوف ہے جو بے حمت۔ بے حیا۔
دشمنِ عصمت۔ نہایت ظالم و مغرور ہے۔
آبرو لے گا مری۔

اتنی نہیں اُسکی مجال۔

گر کیا ایسا تو کھوئے گا وہ اپنا تاج و تخت

جولین

فلورنڈا

جولین

فلورنڈا

جولین

فلورنڈا

جولین

فلورنڈا

جولین

فلورنڈا

جولین

اب نہیں ہر وقت کچھ انکار کا بس آج ہی
تو روانہ ہو جاؤں گے۔ اور اُس کے قصر میں
جا کے رہ آرام سے۔ لیتا رہوں گا میں خبر۔
گر دُور ابھی بے رنجی اُس سے ہوئی ظاہر تو میں
تجھ کو بلوا لوں گا۔ اور دوں گا اُسے ایسی سزا
جو رہے گی یاد

فلورنڈا
تجھ کو عذر کیا۔ جاتی ہوں میں
چھوڑ دوں گی آج ہی تجھ کو
(انگلش ہو کے)
اور آپ کو
(فلورنڈا روتی ہوئی جاتی ہے۔ اور پرودہ گرتا ہے)

(۲)

اس نظم کے متعلق ہمارے پاس عجیب مختلف مذاق کے خطوط آئے ہیں لیکن
کے پرانے شعرا پسند کرنا اور کنا را سے نظم ہی نہیں تسلیم کرتے۔ لیکن انگریزی مذاق
کے قدردانوں نے ہر جگہ پسند کیا۔ اور تاکید کر رہے ہیں کہ جو ڈراما ماہ جون کے
دولگداز نمبر ۶۔ جلد ۷ میں شروع کیا گیا ہے منظر ختم کیا جائے۔ لیکن ڈراما نویس
نے بڑے جوش و خروش کے ساتھ ہمیں مہبت دلانی ہے۔ اور یہاں تک لکھ دیا
ہے کہ ہم مخالفت کی بالکل پروا نہ کریں۔ علی الخصوص خواجہ نور محمد صاحب
نے جو کلکتہ کے ایک کالج میں بی اے کی تعلیم پڑھ رہے ہیں ایک بے جوش اور دل
خط لکھ کے ہمارا حوصلہ بڑھانے کی بے انتہا کوشش کی ہے۔ ہم ان کا خط مانع
کر دیتے۔ مگر افسوس دولگداز میں اتنی گنجائش نہیں ہے۔

بر تقدیر اگرچہ ہم نے ابھی تک ڈراما کے ختم کرنے کا قطعی ارادہ نہیں کیا
ہے۔ لیکن اس پرچے کے ذریعے سے ایک اور سین تذکرہ نگارین کرتے ہیں۔ اور امید
ہے کہ احباب کو غور فرما کے دوبارہ اور زیادہ استقلال سے اپنی رائیں قائم

کریں گے۔ اگر انھوں نے پسند کیا تو ہم اس قسم کی نظم کا سلسلہ زیادہ محنت اور زیادہ خوش اسلوبی سے جاری رکھیں گے۔

دوسرا سین - آدھی رات

اشخاص

راورق - شہنشاہ اسپین - فلورنڈا - جولین کی بیٹی - مریم - فلورنڈا کی ماموں زاد بہن - راورق کی ساقیہ - حبشی راورق کے دربار کا جلا د -

سین

دار اسطنت اسپین ٹالڈو میں راورق کے محل کا ایک کمرہ - فلورنڈا کا خوابگاہ -

حالت

فلورنڈا اکیلی اپنی خوابگاہ میں ایک کرسی پر متر و بٹھی ہے۔ سامنے مشرق کی طرف ایک کھڑکی کھلی ہوئی ہے اور وہ گہرا گہرا کے کہہ رہی ہے۔

فلورنڈا

کس غضب میں پڑ گئی ہوں! آہ! کچھ بتائیں!
کیا کروں؟ کس سے کہوں؟ کیونکر بچوں؟ اور کون؟
جسکے آگے سر کو دے ماروں؟ یہاں کوئی نہیں
جو خبر لے اس مصیبت میں مری۔ افسوس! میں
پھنس گئی کیسی بلبائیں؟ میں تو آتی ہی نکلتی۔
آہ! والد نے نہ مانا! او کیجیے قسمت میں اب
کیا لکھا ہے؟ اور کیسی دلتیں ہوتی ہیں؟ لے
راورق ظالم تجھے کچھ شرم بھی آتی نہیں؟
مر نہیں جاتا ہے کیوں؟ جو تیرے ظلموں سے بچیں
اڑ کیاں شاہی گھرانے اور معزز لوگوں۔

کون؟

(کون کچھ آہٹ پا کے)

(مریم دروازہ کھول کے آتی ہے)

میں -

مریم

فلورنڈا (نہایت متوجہ ہو کے)

بتاؤ کیا ہوا؟

مریم (سکرا کے)

سب خیریت ہے ہاں

(حیرت سے)

بیچائی کی منہی!

ہرگز نہیں۔ سنیے تو آپ۔

گو گئی بے آبرو ہونے کو تھی۔ لیکن وہاں

مل گئی اک رحمدل خاتون۔

فلورنڈا

مریم

اور وہ کون تھی؟

راورق کی ساتھیہ۔ جو دکھ کر بکیں سمجھے۔

مہرباں مجھ پر ہوئی اسی کہ اک تہہ پر سے

آبرو سیری بچا لی۔

کس طرح؟

فلورنڈا (خوش ہو کے)

مریم

ایسے کہ وہ

جب ہوا بدست بی بی کر تو بیوشی کا جام

اک دیا ایسا کہ بالکل بے خبر وہ سو گیا

تب سلا کے اُس کے پہلو میں کوئی اٹکی کینیز

یہ کہا مجھ سے کہ بھاگیاں سے تم۔

فلورنڈا

عورت نہیں

وہ فرشتہ تھی مدد کی جس نے ایسے وقت پر۔

آسمان کی طرف سر اٹھا کے شکر ہے تیرا خدا! اب مجھ کو بھی اُمید ہے

کیا عجب سیری مدد بھی وہ کرے۔ اور چٹخکوں

راورق کے ظلم سے۔

(مریم کی طرف دیکھ کے)

تو اے بہن چل دی کہیں

مجھ کو بھی اُس سے ملا دو۔ کیا عجب آئے اُسے

سیری حالت پر بھی رحم۔

آپ اس گھڑی وہ آئیں

مریم

سکتی ہے یاں تک گر میں جاتی ہوں ٹھونڈھوں
جلد آتا —

لاتی ہوں اُسکو ابھی گر مل گئی۔

(مریم جاتی ہے)

یا خدا قربان ہو جاؤں ترے اس رحم کے
کیسی مایوسی تھی؟ یا اب کیسی خوش ہوں۔ بس نہیں
کوئی حامی سیکسوں کا، سو اتیرے۔ یہاں
بھیجا خود والد نے تھا جیرا مجھے۔ تو راورق
کتنا بد کردار، کتنا بیخیا ثابت ہوا؟
آبرو لینے کا درپے وہ آدمی۔ اور اس طرف
بن نہ پڑتی تھی کوئی تدبیر۔ تب گھبرائے ایک
آدمی کو میں نے دوڑایا کہ سبطہ میں کرے
جا کے والد کو خبر۔ اور وہ لمبائیں جھکو جلد۔
کچھ پتہ اُس آدمی کا بھی نہ تھا۔ حیران تھی۔
ایسی مایوسی میں لے بیٹھے خدا کے۔ اور لے
پاک خاتونِ معظم تم نے کی آسان ہے
میری مشکل۔

(مریم آتی ہے اور ساقیہ اُسکے ساتھ ہے)

ٹھونڈھ لائی میں نہیں

حاضر ہوں میں

شاہزادی۔ حکم کیا ہے آپ کا؟ ارشاد ہو۔
آبرو میری بچالو۔

گر چہ یہ دشوار ہے

میں گر کوشش کروں گی

صبح اب ہونے کو ہے۔

فلورنڈا

مریم

فلورنڈا

مریم
ساقیہ (ہاتھ جوڑ کے)

فلورنڈا

ساقیہ

مریم (دائق مشرق کو دیکھ کے)

معنا میں شر

دیکھئے جھوٹے نسیم صبح کے وہ آپکی نظم پڑھا
 زلف برہم کر رہے ہیں اور تاروں کے چراغ
 جھلکتے ہیں فلک پر۔ اور سیہ چادر شب
 کی سکتی جاتی ہے۔ ایسا نہ ہو چڑیاں اٹھیں
 اور جگا دیں رازِ حق کو۔ میں تو جاتی ہوں بہن۔
 کیا کروں گی جا کے اب؟

ان کو نہ رکھیں
کس لیے؟
بادشتہ کو اگر ذرا بھی شک ہوا تو ایسے مجھے
اور ان کو قتل کر ڈالیں گے۔

توجا و بین -

اب کہاں جاؤ گی تم؟

جس جاؤا لیجائے

کس طرح جاؤ گی یاں سے؟
خاک اڑاتی ٹھوکریں
کھاتی۔ تنگے پانوس۔ جاؤ گی بین۔ اوجس طرح
بین پڑے گا۔ آپ کو پوچھاؤں گی۔ تریوں میں۔
کیوں نہیں جاتی ہو سبطہ میں؟ جہاں آرام سے
قصر میں اپنے پھوپھا کے زندگی بھر رہا کو
خیر جاؤں گی وہیں

لیکن وہاں تو ان دنوں
ہوگی یو ریش کافروں کی ہر طرف - اور کوئی شخص
جانہ سکتا ہوگا اندر شہر کے

میں جاؤنگی جیسے بنے
تو مرا سب حال کہہ دینا۔

فَلَوْلَا

21

فقط در

لے

قلوب زندا (دوستو بہا کے)

مرحوم

ساتھ

مریم
فلوریڈا

مریم
فلورنڈا

فلورنڈا

ضرور

اور یہ کہ اب

جھکو داں جلدی بلالیں

لو خدا حافظ بہن -

مریم

(مریم جاتی ہے)

اک بہن یاں مل گئی تھی - وہ بھی آخر چھٹ گئی -

فلورنڈا (رورو کے)

گو کہ پہلے ہی زمانے کی ستائی تھی مگر

کھینچ کر لائی گئی دینے کو اپنی آبر و

خیر تو وہ بچ گئی -

ساقیہ (تشفی دینے کے لیے ہیں)

یوں ہی پھیں گی آپ بھی

صبر کیجیے شاہزادی - اور نہ اب گھبرائیے -

میں تو خدمت کے لیے حاضر ہوں مگر مریم نہیں؟

اُن سے زیادہ میں مدد دوں گی ہمیشہ -

فلورنڈا

نظم سے

راورق کے میں بچوں و شواہج -

ساقیہ

دیکھیں تو آپ

کیسی حکمت سے بجاتی ہوں - مجھے اک خوب چیز

ہمہ آئی ہے - جہاں اک جام اُس کا دے دیا

بس نہیں رہتی ہے اُن کو دین و دنیا کی خبر -

یوں ہی مریم کو بچایا - اور یوں ہی آپ کو

ہاتھ سے اُنکے بچا دوں گی

(ناگہاں وردازہ کھلتا ہے - اور راورق غصے میں بھرا ہوا آ جاتا ہے)

راورق

یہ کیا سنتا ہوں میں!

تو اور ایسی نابکار! اچھا ٹھہرا! جلدی ستا

(ساقیہ سے)

کیا ہوئی مریم؟ کہاں ہے وہ؟

ساقیہ - (قدموں پر گر کے)
 را ورق
 نہیں مجھ کو نیر
 سب شرارت ہے تری قُطامہ
 کوئی ہے یہاں؟
 (پکار کے)
 (ایک جھشی ننگی تلوار لیے ہوئے آتا ہے)
 سر اُڑا دو اس کا لیجا کہ
 ساقیہ (قدموں پر لوٹ کے)
 خطا ہوا اب صاف
 پھر قصور ایسا نہ ہو گا
 را ورق
 تو ابھی مریم کو لا۔
 ساقیہ
 اُسکا ملنا تو نہیں ممکن ہے اب
 را ورق
 تو قتل بھی
 (فلورنڈا کی طرف دیکھ کے)
 ہو گی تو اور لوں گا بس بدلتا فلورنڈا سے۔ بس
 چل ابھی تو ساتھ میرے۔ اور دیکھیں کس طرح
 یہ سچا لیتی ہے جھگو آج میرے ہاتھ سے
 (ساقیہ کو جھشی۔ اور فلورنڈا کو را ورق زبردستی پہنچ لیجا تے ہیں اور پردہ کرتا ہے)

(۳۳)

اس پرچے میں ہمارا ارادہ نہ تھا کہ اس ڈراما کا کوئی حصہ شائع کریں۔ بلکہ
 پرچے کے لیے بعض اور مصائب مرتب کیے جا چکے تھے لیکن بعض قدروں اور قدروں
 اچھا بنے تاکید ہی خطوط بھیج کے اس قدر اصرار کیا اور یہاں تک مجبور کیا کہ ہم ایک نمبر
 مضمون کو نکال کے اس ڈراما کو خوشی کے ساتھ شائع کرتے ہیں۔ فی الحال معزز ریڈیٹر
 پنجاب آبرور اور مسلم کمرانگل وغیرہ نے رائیں بھی لکھی ایسی موافقت میں دیں کہ
 تعلیم یافتہ جماعت میں زیادہ شوق پیدا ہو گیا۔ اور اب یہ مناسب ہو گا کہ یہ سلسلہ
 جہاں تک ہو پورا کیا جائے اور دنگلہ زمیں آخر تک تھوڑی بہت اس قسم کی نظم
 ضرور شائع ہوتی رہے۔

تیسرا سین۔ آدمی رات

انتہا خاص

کونٹ جولین حاکم سبطہ۔ افسران فوج۔ گالیس فلورنڈا کا غلام۔

سین

قلعہ سبطہ۔ جبکہ عرب اسے چاروں طرف سے گھیرے ہوئے ہیں۔ کونٹ جولین کی خوابگاہ

حالت

کونٹ جولین ایک بچھونے پر تنہا لیٹا سو رہا ہے۔ سوتے سوتے کچھ شور سن کے چونک پڑتا ہے۔ گھبرا کے اُٹھ بیٹھا ہے۔ اور آپ ہی آپ کہہ رہا ہے۔

جولین (غرمندی و پریشانی کے ساتھ) شور یہ کیسا ہے! کیوں غل ہو رہا ہے! کیا عرب

اس طرف بھی آگئے؟ لیکن نہیں۔ ساحل یہاں

کون آسکتا ہے! ان میرے جہازوں کی فضیل

توڑ کے؟

(کچھ آہٹ پائے)

کون؟

(چند افسران فوج ایک شخص کو پکڑ کے لاتے ہیں)

آپ کے خادم

بتاؤ کیا ہوا؟

افسر جولین

(ہاتھ جوڑ کے)

خیرت۔ اقبال شاہی کا ستارہ ہو لبند

اور جو اس تاج کا بدخواہ ہو پامال ہو۔

ایا ہوا جلدی کو۔

(ناگوار سے)

جولین افسر

بہتر حضور۔ اس جہنمی

شخص کو پکڑا ہے ہم نے چونکہ اس نے اپنے

ایک کشتی سے اتر کے چپکے چپکے آگیا

تاکہ داخل ہو جائے قلعہ میں

اس سے بھی کچھ

جولین

تم نے پوچھا تھا؟

حضور اسکا بیاں ہے یہ کہ یہ
شاہزادی کے غلاموں میں جو۔ اور لایا جو ان
کا پیام اسپن سے سرکاریں
تو کون ہے؟

گالیس؟ (غور سے دیکھ کے)

جی

تو جو؟ کیونکر آسکا تو ان دنوں؟
سخت و شوری سے اپنی جان پس کھیل کے
آیا کمون۔ جبرالٹر میں ہفتہ بھر سوخا کیا
اور کچھ تہہ بر آنے کی نہ بن آئی تو پھر
سیکھ کر مین پیرتاواں سے چلا

بے کشتی کے؟
جی نہیں۔ ساتھ ایک کشتی تھی۔ مگر جب دشمنوں
نے مجھے دیکھا تو دریا میں کودا۔ اور بس
مار کے غوطہ بڑی شکل ہو گیاں تک ہو نہا ہوں۔
واقعی انعام کے قابل ہے تو۔ اچھا بتا
کیا خبر لایا ہے؟

گالیس (افسروں کی نظر اشارہ کیے)
جولین (افسروں سے) یہ تمھاری ہوشیاری قابلِ تعریف تھی
خیر اب جاؤ۔

ابھی

(جاتے ہیں)

بتلا فلورنڈا کا حال
خیریت سے ہیں مگر جاتے ہی داں ملے بادشاہ

جولین (گالیس سے)
گالیس

افسر

جولین

غلام

جولین

گالیس

جولین

گالیس

جولین

افسر

پھنس گئیں اک سخت آفت میں

وہ آفت کیا بول؟

راورق نکلا عجیب بدکار و ظالم لے حضور
پہلے تو اُس نے بڑی خاطر تواضع کی۔ مگر
اب تو دشمن عزت و ناموس کا ہے ورپے آٹا بھجوا
آبرو لینے پر آمادہ ہے۔

جو لین
گالیس

ظالم راورق!

شاہزادی کی ابھی تک تو بچی ہے آبرو۔
لیکن اب صورت نہیں بچنے کی کوئی۔ جلد آپ
اُن کو یاں بلوائیں۔ ورنہ خوف ہی اس بات کا
ساتھ عزت کے وہ اپنی جان بھی دیدہ گئی

جو لین (ایتاب ہو کے)
گالیس

آہ!

جو لین

وہ نہ جانتی تھی۔ مگر میں نے اُسے بھیجا بہ جبر۔
مگر اُسے حد نہ کوئی چو خپا تو میں مر جاؤں گا
زہر کھا کے مر گئی کروہ تو یہ جانو کہ میں
اُس کا قاتل اور اُس کی جان لینے والا ہوں۔
راورق ملعون۔ بے دین۔ بیچارہ۔ بے نصیب

(عصہ سے)

کیا ملے گا تجھ کو میرا دل دکھائے؟ آہ اب
استقام اُس سے مل سکتا نہیں ہوا ان دنوں
یاں عرب کی ویرانیں ہیں اور اُدھر وہ بیچارہ
عزت و ناموس کے پیچھے پڑا ہے کیا کروں
میں تو یاں اُس کے لیے دشمن سے اٹرا ہوں۔ اُدھر
وہ مری بیٹی کی عزت لے رہا ہے اخیر اب
مگر مجھے دشمن بنانا ہے تو میں بھی شوق سے
اُس کا دشمن بن جاؤں۔ ان شرقی لوگوں سے یہ

جنگ کیوں ہے؟ پس نقطہ دینی حیت کیلئے۔
 ساری سبطہ کی رعایا۔ یہ بہادر۔ یہ ڈیوک۔
 جان دیتے اور خون اپنا بہاتے ہیں یہاں۔
 قلندر سبطہ گھرا ہے ہر طرف سے۔ اور آگ۔
 تیر۔ پتھر۔ رات دن پرسلتے ہیں دشمن۔ یہ ب
 محض اسکے واسطے برداشت ہم کرتے ہیں۔ پر
 وہ نہیں باز آتا اپنی حرکتوں سے۔ اور آہ!
 خود مری عزت کا دشمن ہے۔ تو خیر اب صبح ہی
 صلح کروں گا مسلمانوں سے۔ جو ہیں با وفا۔
 با حیت۔ قول کے سچے۔ جت ہی راستہ۔
 بات کے اپنے دھنی۔ سب کو ہے اُنکا اعتبار
 مین بھی بنکے دوست اُن کا اور کر کے آشتی
 اُن سے کہتا ہوں کہ مجھ کو اور میری فوج کو
 ساتھ لے کے اندلس پر حملہ آور ہوں۔ یونہی
 انتقام اُس سے لیگا۔ اور میں سب غلبوں کا
 اُس سے بدلہ لوں گا اپنا۔ غیظ شہ کے خاندان
 کے بھی آنسو بچھوں گا دیکے سزا کجبت کو۔
 بس یہی اب ٹھیک ہے۔ اور اور قی۔ رہ منتظر
 اُس گھڑی کا ہتھائیں جب عر کے باو پا
 سرزمین میں اندلس کے خوب زور و شور سے
 تیرا جھنڈا اور تیرا اقبال یہ پامال ہو۔
 اور وہ برج طلسمی کا سماں پیش نظر
 تیرے ہو اُس وقت میں سرور ہونگا۔ اور ب
 ظلم کے تیرے ستائے ہوئے شادوں دیکھ کر
 تھکے پھر خون میں تھکے تر پتا خاک میں

(گالیس سے)

خیر اب لے گا لیس جا کل لوں گا صبح کو
اور بھیجوں گا کسی کو اندلس میں۔ تاکہ جلد
وہ فلورنڈا کو لائے اس شہتی کے قصر سے۔
انتظام اسکا کر جلدی ہو۔

گالیس
جولین

میں خود چاہتا
ہوں کہ بلواؤں مگر جب تک نہ ہوگی صلح کچھ
بھی نہیں بن پڑتا ہے
گر حکم ہو تو یہ غلام

گالیس

جائے کو حاضر ہے

لیکن گالیس اس کام کے
واسطے بھیجوں گا میں اپنے امیروں کو جو عقل
سے عرب لوگوں کو راہنی کر سکیں جاتے ہی وہاں
اور اسکے دوسرے ہی دن میں بھیجوں چند لوگ
اندلس میں تاکہ لائیں وہ فلورنڈا کو ساتھ
جو ہومر ختی مبارک

جولین

گالیس

ہاں بس اسکے آتے ہی
اُترے گی قوج عرب اسپین میں جو ہر طرف
لوٹیں گے اس سرزمین کو اور میں ٹکس جاؤنگا
قصر میں رہتی کے لینے کو اپنا انتقام
وہ گالیس سلام کر کے جاتا ہو۔ جولین کچھ نے پلٹا ہو۔ اور پوہ گرتا ہو

چوتھا سین۔ سپر

انتخاص

عیسیٰ بن مزاحم۔ ایک نوخیز لڑکی مریم جے عیسیٰ فلورنڈا سمجھتا ہے۔ اور تھیوڈورا
جولین کی بی بی

حالت

عیسیٰ اپنے بُرج سے کھل کے قلعے کے اوپر دیا کے کنارے کنارے چل رہا ہے اور
غروب آفتاب کا تاثر دیکھتا ہے۔

عیسیٰ (خود بخود) آہ دینا۔ تجھ میں کیا کیا لطف ہیں کہیں شان سے

دیکھو سورج ڈوبتا ہے! اور کہیں کس طرح

پانی پر نشان چھڑکتی ہیں! اور اُس کو ہمار

کو طمانی کپڑے سورج نے پھلے ہیں۔ جہاں

گھاس کی وہ تھنی تھنی تیناں اس دھوپ میں

جنگلوں کے شل تاباں ہیں۔ وہاں اُس تل سے

کیا طمانی جھالیں نقش کی لٹکانی بین با

پھول بھی ہر رنگ کے اُس جا کھلے ہیں۔ اور وہ

دیکھو کلیاں مسکراتی ہیں عجب انداز سے!

دیکھ کر یہ لطف چڑیاں کیسی خوش ہیں! اور کس

جوش سے سب چھپا اٹھتی ہیں! کیسی شاد ہیں!

جس کو دیکھو خوش ہیں۔ لیکن آہ! اک میں ہوں کہ دل

کو قرار آ نہیں۔ اُبھن جو۔ بتائی ہو۔ اور

ہر گھڑی اک درد ہے۔ پیاری فلورنڈ! اُبھ

اک نظر دیکھو تو میں آئے۔ کہاں ابے نصیب

میں ترپتا ہوں جہاں۔ نواز نس کے باغوں میں

سیر کرتی۔ ناز سے اٹھلاتی۔ ہنستی۔ بولتی۔

کھلکھلاتی۔ توڑتی پھولوں کو۔ پھر اُنکو عجب

ناز سے سر پر لگاتی ہوگی۔

(کچھ آہٹ پا کے اور ایک آواز سن کے)

کیا! یہ کون تھا؟

کس کی یہ آواز تھی؟ دلکش۔ سُریلی۔ نغمہ خیز

(ادھر ادھر دیکھ کے)

(تھیو ڈورا اور مریم آ جاتی ہیں)
 ٹھٹھ کے اور کچھ کہتے کہتے رکے کون ہیں یہ؟ خور ہیں؟ یا پران ہیں؟ انکا فرق
 سب پہ غالب ہو گیا ایسا نہ ہو یہ بھاگ جائیں
 دیکھ کر بھگو ہیاں۔ اچھا چھپا جاتا ہوں میں
 اور دیکھوں آکے کیا کرتی ہیں۔

(اپنے کمرے میں چھپے کھڑا ہو جاتا ہے)

تھیو ڈورا

بیٹی دیکھ۔ یاں

گر گھڑی بھر کو بھی آ جاؤ ہل جاتا ہے دل
 واہ وا وا! خوب سیریں میں ہیاں۔ اور اس گھڑی
 آگے بڑھتی جاتی ہے) تو مجھے جنت سے زیادہ لطف آتا ہے نظر۔
 وہ ہاڑ۔ اُنکے ورے۔ سبز۔ درخت۔ اور دویہ
 یہ سمندر۔ اسکی لہریں۔ کشتیاں۔ اور یہ جہاز
 یہ ہوا سے پھولے پھولے بادیاں۔ پھر اُنکے ساتھ
 ڈوبنا خورشید کا۔ قوس قزح کی یہ ہمار
 کیا یہی جنت ہے

مریم
 تھیو ڈورا

بیٹی جس جگہ انسان کا

دل ہل جائے وہی فردوس ہے۔

لے اماں جان

مریم

میں تو بہتی رات دن یاں

اور یہ کمرہ تو میں

جانتی ہوں خالی ہوگا

(جس بُرج میں عیسیٰ ہے)

اُسے دیکھ لے)

اک سبز میماں

تھیو ڈورا

اس میں ٹھہرے ہیں

وہ کون؟

اک انسر فرج عرب

مریم
 تھیو ڈورا

گھیرے تھے اس قلعہ کو پہلے گلاب دوست ہیں
 صلح نے ہم کو ملا کے کر دیا شیر و شکر -
 اور بے خوف و خطر پہنچ گئے وہ اس جگہ -
 ہم بھی خوش ہیں دیکھ کر ایسا معزز یہاں
 اپنے گھر میں -

(عیسیٰ بیک ایک باہر نکل آتا ہے)
 بیسیو - شکریہ ان الطاف کا -

غیر ممکن ہے - مگر یہ آپ کا لطف و کرم -
 نقش ہے دل پر مرے

اور آپ اے زمر حبیب
 شاہزادی اشوق سے رہے یہاں میں جاگے اب
 فوج میں اپنی رہوں گا -

عیسیٰ (جوش کے ساتھ)

(مریم کی طرف متوجہ ہو کر)

مریم (شرائے)

میرا یہ مطلب نہیں
 تھا کہ میری وجہ سے کچھ آپ کو تکلیف ہو
 محض یہ نہیں کہ اٹھی تھی - ورنہ حضرت آپ تو
 میمان ہیں - اور ہم پر فرض ہر سرائیکھوں سے
 آپ کی خدمت کریں -

لیکن مرے نزدیک تو
 آپ مجھ سے بڑھکے بیان رہنے کے قابل ہیں

یہ کیوں؟
 کیونکہ میں خالی پڑا رہتا ہوں اس کمرے میں اور
 جب کبھی گھبراتا ہے دل سیر کرنے کو نکل
 آتا ہوں یاں دیکھنے کو یہ سماں - لیکن جناب
 آپ یاں ہونگی تو اس گورے - پیارے - دلبر -
 تازنیں - ناز آفریں چہرے سے رونق پائیگی

عیسیٰ

مریم عیسیٰ

یہ بہادر اور آپ کا حسن جمال اک شمع کے
 مثل اپنی روشنی کے بزم قدرت کو بہت
 جگہ لگا دے گی۔ تو اے غنچہ دہن اس سین کا
 لطف بڑھ جائیگا۔ اور اہل یہ روح افزا بہار
 ہوگی وہ چند آپ کے ان لالہ گوں خساروں کے۔
 اس لیے بس آپ ہی رہیے یہاں۔ یہ خاکسار
 جاتا ہے
 یہ غیر ممکن ہے۔

نہیں بس آپ ہی
 رہیے اس کمرے میں جن کی ذات سے ہر وقت
 باغ قدرت اور جو۔

بیٹی بس اپ چل

چلتی ہوں
 جائے گا خیر۔ لیکن سیر کبجے دو گھڑی
 جلدی کیا ہے؟

پھر کبھی آئیں گے اب تو ایک

کام ہے جسکے لیے جاتے ہیں۔
 (تھیوڈورا مریم کو ہاتھ پکڑ کر کہنے لگتی ہے)

کیوں؟ یہ کون تھی؟

عیسیٰ (تھوڈوری پریشان رہ کر)

خیر کیا اس سے زیادہ خوب رو ہوگی؟ نہیں
 تو فرشتہ ہوگی یہ؟ یہ بھی نہیں؟ یوں کا حسن
 بھی سنا ہے دل رُبا ہوتا ہے۔ لیکن معتد
 دلستانی ان میں ہو۔ ممکن نہیں۔ پھر کون تھی؟
 بس غور نہ اُجھی تھی اور اُس کے ساتھ تھی
 اُس کی ماں بیٹی کہا بھی اُس نے تھا۔ کیا آگئی

مریم
 عیسیٰ

تھیوڈورا

مریم
 عیسیٰ

تھیوڈورا

آنڈس سے وہ - مگر موسیٰ تو کہتے تھے کہ بعد
چند دن کے آئے گی - کیا چولین نے جھوٹا
اُنکو فقرہ دے دیا؟ بیشک یہی ہے - دریاں
کس طرح وہ آئی؟ اُسکے سوا پھر اور کون
خود ہو سکتا ہے ایسا کہ پہلی ہی نگاہ
لے گئی دل سے مرے صبر و قرار؟ اور کس حسن
کے مقابل روشنی سورج کی مٹ سکتی تھی؟ یا
چاند کا چہرہ اُتر جاتا؟ منور زہا اسی تھی
تو گئی کس جا؟ کہاں غائب ہوئی؟ (اور آہ میں
(موسیٰ آ کے سامنے کھڑا ہو جاتا ہے)

دل کو کیونکر بھر میں بہلاؤں؟
(کچھ آہٹ پائے)

موسیٰ
کیسے کس

موسیٰ (سکرا کے)

سوچ میں ہیں؟
آپ تو کہتے تھے وہ آپس میں

عیسیٰ

ہو - مگر میں نے خود اپنی آنکھ سے دیکھا یہاں -
کس کو صاحب

موسیٰ (قریب آ کے)

عیسیٰ

شاہزادی فلورنڈا کو - اور
کس کامیں شتاق ہوں؟

موسیٰ

وہ تو جناب اس قلعہ سے
مہلتیں گزریں روانہ ہو چکی - جب ہم یہاں
فوج لے کر آئے تھے اور گھیرا تھا سب کو اس
سے بھی پہلے جا چکی تھی وہ

غلط

عیسیٰ

موسیٰ

خود جو لین

عیسیٰ

مجھ سے کہتا تھا

غلط اُس نے کہا

موسیٰ

کیوں کیا سبب؟

جھوٹ کہتا مجھ سے وہ؟

عیسیٰ

میرے سبب لے امیر

آپ کو فقرہ دیا اُس نے

موسیٰ

تو میں پھر پوچھوں گا۔

عیسیٰ

اب تو اے سردار مجھ میں ضبط کی طاقت نہیں

جائے اس وقت میں اک دو گھڑی کے واسطے

جا کے تنہائی میں روؤں اپنی قسمت پر ذرا

(اگرے میں جا کے دروازہ بند کر لیتا ہوں اور سوئی بھی چند ساعت کے بعد بٹل جالتے ہیں)

(۴)

نظم معجزی کو ہم آئندہ سے نظم معری ہی لکھا کریں گے۔ ہمارے لائق و معزز دوست جناب مولوی محمد عبدالحق صاحب ہیڈ ماسٹر مدرسہ آصفیہ حیدرآباد دکن نے اس نظم کے لیے یہ نام تجویز فرمایا ہے جو ہمیں بہت پسند ہے ہمارے نو عمر دوست تجل شاہ خان صاحب شفق رامپور سے لکھتے ہیں کہ نئے نام کی کوئی ضرورت نہیں۔ وہی پُرانا نام "نثر مرجز" کافی ہے۔ یہی مصنف مولوی میر علی حیدر طباطبائی پروفیسر نظام کالج کی نظم سے ظاہر ہوتا تھا۔ اور یہی دیگر اساتذہ فن بھی فرماتے ہیں۔ مگر اصل یہ ہے کہ ہم اگر اس قسم کے کلام کو نثر تسلیم کرتے تو نثر مرجز ہی کہتے۔ ہم تو اسے نظم سمجھتے ہیں۔ اس لیے کہ بحر اور وزن کی پوری پابندی کی جاتی ہے۔ لہذا ضرور ہے کہ ایک نیا نام بھی تجویز کیا جائے۔ اور وہ نام ہی اچھا معلوم ہوتا ہے جو مولوی عبدالحق صاحب موصوف نے تجویز فرمایا ہے۔

پانچواں سین۔ آدھی رات

اشخاص

عیسیٰ بن مزاحم۔ اگتا دیو ہسپانیہ کا ایک معزز سردار۔ اُس کے چند ہمراہی ہسپانیہ کے وہ غلام۔ مریم۔ جو کہیں۔ عیسیٰ کے چند ہمراہی۔

حالت

ساحل بحر۔ طوفان بپا ہے۔ موجیں اٹھ رہی ہیں۔ اور رات کے سناٹے میں ہسپانیہ کی ایک کشتی قلعہ سبطہ کے نیچے کنارے سے بندھی ہوئی ہے۔ ہسپانیہ کے چند سپاہی اور غلام کچھ کشتی میں اور کچھ کنارے خاموش کھڑے ہیں۔ سناٹے قلعے کا کوٹھا اور برج ہے۔ جس پر یکایک عیسیٰ آ کے ٹھہرا شروع کرتا ہے۔

عیسیٰ (خود بخود) اے سمندر! میرے دل کی طرح تجھ میں بھی یہ جوش

کس لیے پیدا ہے؟ یہ دیوانہ کی کیوں؟ ہند من کھٹ

بھر بھر آتا ہے تیرے؟ کس پر غصہ؟ کیا کسی

عارضہ گلوں کا دیوانہ بنے تو بھی؟ سچ بتا۔

ورنہ یوں سر کو چٹکنا۔ اور دوسے دے مارنا

پتھروں پر۔ غیر ممکن تھا۔ یہی ہو حال سب

عاشقوں کا۔ عشق! پُراندوہ و پرآلام عشق!

ظلم سے تیرے بچا ہے کوئی بھی؟ کسار سے

چ رہی ہیں آنسوؤں کی ندیاں اور اندھیاں

خاک اڑاتی پھرتی ہیں۔ اور آہ تو لے آسمان

ماتمی پوشاک پہنے ہے خود اپنے سوگ میں۔

اور تارے گویا انگارے ہیں جن پر لوٹتی

ہے نظر میری مری اُمیدوں کو لے کر عجب

بیقراری اور بیتابی کے ساتھ

(نیچے کشتی اور لوگوں کو دیکھتے ہی چونک کے)

ایں! کون لوگ
ہیں یہ جو اس وقت آئے ہیں یہاں؟ کس کام کو
اس گھڑی آئے گا کوئی؟ خیر کوئی کام بھی
ہو۔ مگر کیوں چپ ہیں یہ سب؟
(کچھ آواز سن کے)

وسنو کچھ کہتے ہیں۔
اُنکے سین سر پر آ کے چُپا کھڑا ہو جاتا ہے
دیر کیوں اتنی ہوتی؟
آتے ہونگے

ہسپانیہ کا سپاہی
دوسرا۔
پہلا

پھنس نہ جائیں قلعہ میں
اکتا دیو ایسے نہیں
باز اُڑا ہے اگر تو قمری کو کپڑی لائے گا
چپ رہو اب سن نہ لین کوئی۔

دوسرا

پہلا۔
غیسی (چونک کے)

قمری! قمری کیا؟
کس کو قمری کہتے ہیں؟ ہونہ ہو چھ راز ہے۔
اور اندیشہ بھی ہے تو مستعد ہو جاؤں میں بے
(تلوار کھینچ کے غائب ہو جاتا ہے۔ پھر نیچے اکبر دروازے
سے سر نکال کے۔ اور ایک طرف دیکھ کے)
کون لوگ آتے ہیں یہ؟ میں چھپ رہوں۔
دیکھوں کیا کرتے ہیں؟

داکتا دیو اور مریم باتیں کرتے ہوئے گزر رہے ہیں
بس دوسری قدم اوڑھ

اکتا دیو۔
مریم

اباجان
کیوں یہاں آئے ہیں آدھی رات کے وقت اور کیوں

اکتا دیو

جکوبو بویا ہے ؟

آیا اندلس سے ہے کوئی

شخص۔ شاید اُسکو چھپوائیں گے

(عیسیٰ اُن کے گزرنے کے بعد دروازے سے سر نکالتا ہے)

بیشک کوئی

عیسیٰ

نقشہ ہونے والا ہے۔

اکتا دیو رشتی کے پاس پہنچ کے

گشتی میں چلے

میں نہیں

مریم

جاؤں گی گشتی میں۔

کیوں؟

اکتا دیو

کیوں جاؤں گی کیا کھا جاؤں؟

مریم
اکتا دیو۔ (اپنے لوگوں سے)

اس کو لیجاؤ

(وہ غلام زبردستی مریم کو پکڑ کے گشتی میں لے جاتے ہیں)

کوئی سیر می مدو کو آئے۔ ہاں!

(بیچ کے)

مریم

جکوبو پکڑے لیے جاتے ہیں

(ایک شخص گشتی کھولنے لگتا ہے)

وہ تو میں کہتا ہی تھا

(جوش سے)

عیسیٰ

آیا میں گھبرانا نہ تم۔

(جھپٹ کے)

کون ہو تم ظالمو۔ جو رات کو چوروں کی طرح۔

ایک لڑکی کو جبراً کر لے چلے ہو؟

(جو گشتی کھولتا تھا اُسے تنہا سے قتل کرتا ہے)

مرگیا!

سپاہی

(ٹرپ کے مرجاتا ہے)

گشتی میں کود کے کون ہے بتلا؟

عیسیٰ

(ایک اور کو قتل کر کے) نہیں تو تم سبھوں کو یہی گھڑی

قتل کر ڈالوں گا۔ قتل اس کے کہ کوئی بھی نہیں
جان پائے کون تھے؟ کیوں آئے تھے؟ کس واسطے
ایک لڑکی کو لیے جاتے تھے؟

اکتا دیو (بڑھ کے)

پائے گا تو اس

کا جواب اس میری شمیر دیو پکے

عیسیٰ (حملہ کر کے)

تو لے

(اکتا دیو کو مار کے پانی میں گر ادیتا ہے)

مریم (جوش کے ساتھ)

واہ کیا تلوار تھی! کیا ضرب تھی!

اکتا دیو!

ایک ہسپانیہ کا سپاہی

آہ تم مارے گئے تو لوں گا میں ہلا

دوسرا سپاہی

تو میں

بھی تمھارے ساتھ ہوں

(دونوں جھپٹتے ہیں)

آؤ کروں دونوں کو قتل

عیسیٰ

ایک ساتھ —

(دونوں عیسیٰ کے ہاتھ سے مارے جاتے ہیں)

مریم

اے نیک سردار عرب میں آپ کی

لونڈھی ہوں۔ اس جانہ ہوئے آپ گر تو یہ غلطی

لے گئے تھے مجھ کو

عیسیٰ (غلاموں سے جو مریم کو

بولو کون ہو تم لوگ۔ اور

کیوں لیے جاتے تھے اس لڑکی کو؟

پکڑے ہوئے تھے)

حضرت ہم غلام

غلام (دوڑ کے قدموں پر گر کے)

بادشاہ انڈس کے تھے۔ مگر اب آپ کے

بندے ہیں۔

عیسیٰ
علام

کیوں آئے تھے یاں؟

ہل میں یوں جو حضور
بھاگ آئی تھی یہ بڑی تھر سے رزق کے
جس پر ہم ہوئے اُس نے بھیجے تھے یہ چند لوگ
اور افسرین یہ تھا اکتا دیو۔ جو اک بڑا
ہوشیار افسر تھا اس کی فوج کا۔ وہ چپکے
حم کو لایا۔ اور لے آیا ہاں اک فقے سے
تا کہ لے بھاگے اُسے کشتی میں بھلا کے۔ مگر
آپ آپہنچے یہاں۔ یہ بچ گئی۔ اکتا دیو
آپ کی تلوار سے مارا گیا۔ اور اُسکے ساتھ
جو سیاہی تھے ہوئے سب قتل۔ ہم ہیں اب علام
آپ کے

مریم (غصہ سے)

سب جھوٹ ہے۔ اے بہادر مامدار
راورق بے رحم ہے۔ ظالم ہے۔ بدکردار ہے۔
آبرو لیتا ہے سب کی۔ مجھ کو بھی وہ چاہتا
تھا کہ بے عزت کرے۔ لیکن میں اک تدبیر سے
بھاگ آئی یاں تو اُس نے

عیسیٰ (چونکے اور چپان کے)

شاہزادی! آپ ہیں؟

ہاں دہی بد بخت شہزادی ہوں میں جو آپ سے
قلعہ کے اوپر ملی تھی۔

مریم

آپ کیونکر آئیں یاں؟

اُس نے یہ فقرہ دیکھ کر کہ نیچے آجا جان
آئے ہیں مجھ کو بلاتے ہیں۔

عیسیٰ

مریم

تو میں خوب آگیا!

ہاں غصہ ہی ہو گیا تھا۔ خیر چلیے قلعہ

عیسیٰ

چلیے۔ اب لونڈی ہوں میں تو آپ کی
یہ فرض تھا۔

مریم
علیسی

شاہزادی میرا اس دم۔ آئے اور چلیں۔
(علامہ کو رسی بن باڑھ کے)
(ہاتھ پکڑ کے اُسے اور دونوں علامہوں کو اوپر لے جاتا ہے)

(۵)

یہ ڈراما درمیان کے چند نبروں میں شائع نہیں ہوا تو ہمارے احباب
شکایت کے خطوط بھیجے گئے۔ لہذا اس نمبر میں ہم پھر اپنی اس نظم کو جو اردو
کی دنیا میں انوکھی ہے شروع کرتے ہیں۔

چھٹا سین۔ آخر شب

اشخاص

علیسی بن مزاحم۔ مریم۔ ہسپانیہ کے اسیر شدہ غلام۔ جو کین۔ عیسیٰ کے چند ہمراہی ساتھی
مالت

علیسی بن مزاحم اور شاہزادی مریم قلعے پر اُس بُرج کے سامنے نمودار ہوتے ہیں
جس میں علیسی رہتا ہے۔

علیسی
مریم
گر اجازت ہو تو میں لے ماہوش ان حبشیوں
کو ذرا ہونچا دوں اپنے نوکروں میں
جائے۔

علیسی
مریم
میں بھی خست ہوتی ہوں اب
یہی کیا جلدی ہوا ہے

مازنین
پھر آؤں گی
لیکن مجھے کچھ آپ سے

مریم
علیسی

مریم

(خود بخود)

کہنا ہے
تو جائے ٹھہری ہوں میں
(عیسیٰ غلاموں کو لیجاتا ہے)
لے لے بے نیاز
کیا بچی ہوں اس گھڑی۔ ورنہ گئی گدزی ہوئی
تھی۔ خبر بھی کوئی سن پاتا نہ۔ لے بیٹے خدا
کے ترا احسان ہے چونچ گئی میں
(عیسیٰ آتا ہے)

آئیے!
آپ نے مجھ کو بچا یا ہے رہوں گی عمر بھر
آپ کی لونڈی۔ نہ آتے آپ اگر اک لمحہ اور
تو مجھے یہ لے گئے تھے۔ اور ظالم راورد
آبرو لیتا مری۔ لیکن میں اس کے ساتھ ہی
زہر کھا لیتی۔ نہیں تو مار کے اپنے چھری
مر گئی ہوتی۔ غرض جس طرح بتا جان دے
دیٹی میں اپنی۔ بچائی جان میری آپ نے
اب اجازت دیجیے جانے کی مجھ کو
بیٹھیے

عیسیٰ

مریم

عیسیٰ

دو گھڑی یاں۔ ایسی کیا حلہ دی ہے؟
گر کوئی دہاں
جاگ اٹھا تو غضب ہو جائیگا۔

اے نازنین
ماہ سیما شاہزادی۔ اب نہیں ہے ضبط کی
تاب مجھ میں۔ یہ دل دیوانہ بخود ہو چلا
جس گھڑی سے یہ رخ زیبا نظر آیا ہے آہ!

بس تڑپتے ہی گزرتی ہے۔

مریم (حیرت سے)

نہ کیسے اور کچھ۔

میں ادب کرتی ہوں حضرت آپ کا اور اہل میں
یہ نہ تھی اُسید مجھ کو آپ سے!

کیوں!

عیسیٰ

مریم

کچھ نہیں۔

اس کو جانے دیجیے۔ لیکن کسی کو کیا اُسید
آپ سے ہو سکتی ہے۔ جب آپ کا یہ حال ہے؟
میں نہیں سمجھا

عیسیٰ

مریم

یہی بہتر ہے۔ مجھ کو آپ اب

دین اجازت جانے کی

عیسیٰ

کیونکر کہوں؟

(عیسے بے اختیار لپٹ کے اُس کا دوسرے لپٹا ہے)
بس چھوڑیے

مریم (تھنجلا کے)

جاتی ہوں۔ پھر آؤں گی

(ناگماں جولین تنگی تلوار کیسینج کے جھپٹتا ہے)
او سیجا ظالم عرب!

جولین

چھوڑا سے! اور آدھر!

(عیسیٰ سنجل کے اُس کی تلوار اپنی تلوار پر لپٹا ہے)
اُس جولین!

عیسیٰ (چونک کے)

مریم (ماتھ جوڑ کے)

اے ابا جان!

بے خطا بن یہ۔ سمجھ کر کیسیجے تلوار کو۔
پہلے سن نہیں حال۔ پھر جو چاہیں کریں تمہارے

جولین

عیسیٰ

چپ رہا و بدکار نظامہ!

ہوا ہے کیوں ٹری؟

جولین

مریم

جولین

عیسیٰ

جولین

عیسیٰ

جولین

عیسیٰ

جولین

(سوچ کے)

ہوش کی اپنے خبر لے۔
یعنی نو کچھ بند بھی
رکتا ہے؟ ایسے بہت فقرے سنے ہیں۔
آہ! آپ
سُن تو لیں جو کچھ کہیں یہ۔

چھوڑ میرے قلعہ کو
بس نکل جا یاں سے لے بہ کار لڑکی جس قدر
جلد خالی ہو یہ قلعہ تجھ سے بہتر ہے۔ نہیں
ہے جگہ تیرے لیے یاں
(لات مار کے مریم کو زمین پر گرا دیتا ہے)
خیر کہ کیا کہتا ہے؟

سورہا تھا تو اپنے قلعے میں آرام سے
اور یاں جاسوس آئے راورق کے تاکہ اس
شاہزادی کو چڑا لیا جائے دے کہ اس کو دم
لے گئے بیچے وہاں ٹھیلے کے کشتی میں بہ جبر
لیچلے تھے وہ کہ جا ہو نجائیں اُنکے سر پہ۔ اور
قتل کر کے اُن کو۔ لے آیا یہاں اس نازنین
شاہزادی کو

غلط! نکلی یہ کیونکر قلعے سے؟
یہ بھی شامت اور غفلت تیری تھی۔
کیوں؟

یوں کہ وہ
نام سے تیرے بلا کر لگئے اسکو
دکھا

اُن کی لاشیں تو یقیناً آئے مجھے

عیسی

چل ساتھ اور
دیکھ ان لوگوں کو جو کالک لگانے آئے تھے
تیرے منہ میں

جولین (مستند ہو کے)

چل

عیسی

ابھی

(دونوں جاتے ہیں)

میرے خدا اے کارا!

مریم زین پر پڑے پڑے

بڑگی کیسی یہ مجھ پر کیا کروں! بے عزتی
اور رسوائی گوارا کس طرح ہو! ہاے ہاے!
میں تو دنیا سے گئی گنہ گری ہوئی

(اٹھتی ہے)

اور وہ بھی تو

بے گنہ پکڑا گیا ہے!

(کچھ سوچ کے)

اب مجھے کیا چاہیے؟

جب تک آئیں یہ بٹ کر حکم دیدوں نوکروں
کو میں عیسیٰ کے کہ انکے آتے ہی وہ قیدیوں
کو بیان حاضر کریں۔ اور اس طرح اوراک ثبوت
بیگنا ہی کا ہماری پیش ہو

(چلی جاتی ہے اور تھوڑی دیر کے بعد پھر آ کے اسی جگہ بیٹھ جاتی ہے)

میں آ کے یہاں

مریم

کیسی ذلت اور رسوائی

(عیسیٰ اور جولین کے آنے کی آہٹ سن کے خاموش ہو جاتی ہے۔ اور

وہ دونوں آتے ہیں)

تو اب تو آپ کو

عیسی

شک نہیں ہے کچھ؟

جولین

مگر میں پوچھتا ہوں تم سے یہ
گو کیا احسان تم نے مجھ پر کیا سبب
باقہ اس لڑکی کا بڑے کھینچتے تھے؟

ابا جان

مریم (راٹھ کے)

جولین

عیسیٰ

مریم

چپ ہو او بدکار!

پھر بدکار کہتا ہے اسے؟

میں نہیں بدکار ہوں۔ میں نے بچائی اکبرو
راورق کے باقہ سے۔ پہلے وہاں سے بھاگ کے
اور اب اس نیک سردار عرب کی کوششیں

کام آئیں

(عیسیٰ کے نوکر اسیر شدہ حبشیوں کو لے کے آتے ہیں اور جولین اور
عیسیٰ کے سامنے ادب سے کھڑے ہو جاتے ہیں)

خوب آئے تم یہاں اسوقت

عیسیٰ

لے

(جولین سے)

دیکھیے یہ ہیں وہ قیدی

سج بناؤ کون ہو

جولین (قیدیوں سے)

تم؟ بیان کس واسطے آئے تھے؟ کیا کر کے چلے
تھے؟

حضور۔ اسکی حقیقت یہ ہے۔ ہم راورق
کے غلام۔ اور اس نے جب یہ شاہزادی بھاگ کے
یاں چلی آئیں تو نادام ہو کے حکم اکٹا دیو
کو دیا لے کر ہمیں آئیں یہاں سلطنت میں اور
ان کو لے بھاگیں یہاں سے۔

ایک قیدی

چور بھی ہو وہ شقی!

جولین (غصے سے)

خیر پھر؟

قیدی

وہ الغرض لائے ہیں یاں۔ اور آج
رات کو چپکے سے لائے کشتیاں قلعے کے پاس
ہم کو چھوڑا ان میں۔ پھر خود آئے اور کمرے میں
شاہزادی کے۔ کہا ان سے کہ نیچے آپ نے
ہے بلایا ان کو

کس نے؟

آپ نے۔ وہ آپ ہی
کے قودھو کے میں طلی آئیں۔

جولین
قیدی

عجب ابھیر کیا ہوا؟
ان کو لے کر آئے وہ۔ نیچے بٹھا یا کشتی میں۔
اور چلے ہی کو تھے یاں سے۔ کہ ناگہ ایک پیچ
ماری شاہزادی نے اور آپو نیچے

جولین
قیدی

عسی کی نظر اشارہ کر کے

آپ۔ اور آتے ہی
کھینچ لی تلوار۔ مارا ایک کو۔ اکتا دیو
سانے آئے تو وہ بھی کام آئے۔ بعد ازاں
دور فقیوں کو بھی اُنکے جب کیا قتل آپ نے
تب تھے ہم مجبور۔ فوراً سر جھکا یا آپ کے
سانے۔ اور آپ کے ہیں اب غلام

جولین (تلوار پھینک کے)

انسر فوج عرب میں بگماں تھا تجھے آہ
جبکہ تو نے تھی بیکانی آبر و میری

(عسی کے سامنے گھٹنوں کے بل کھڑا ہو جاتا ہے اور ہاتھ جوڑتا ہے)

خدا

کے لیے کروے ختم میری معاف۔ سخت یہ
تھی حماقت میری جو بے سوچے سمجھے کھینچ کے

تین کو جھپٹا تھا تجھ پر اُس پہ جو حسن تھا اور
 آبرورکھ لی تھی میری راہِ رقی کے سامنے
 آہ! کیا ظلم یہ مجھ سے ہوا؟ اب کس طرح
 چار آنکھیں کر سکوں گا تجھ سے۔ پھر حبس مانا
 ہو گا موٹلی کا تو کیونکر بات کی جائیگی اُس

سے؟

نہ کہ کچھ جو لیں اس بارے میں لیکن مرا
 عذر تو سن لے کہ کیوں ہاتھ اس پیاری نازنین
 کا پکڑ کے کھینچتا تھا میں
 نہیں۔ اب پھر کبھی

عیسیٰ

جولین

اسکو سن لوں گا۔
 مگر میں تو سناؤں گا ابھی
 بارہٹ سکتا نہیں دل سے مرے جینک بیان
 کہ نہ دوں گا مٹا مٹا اس کو کہ کیوں اسی خطا
 ہو گئی مجھ سے

عیسیٰ

جولین

نہ کہ شد اب زیادہ فی لیل
 بس نہیں ہے اب اب سننے کی مجھ میں کھڑی
 کل کہے گا سامنے موٹی کے۔ تو اس وقت میں
 غور سے سن کر تباؤں گا۔ خطا کر اب معاف
 اور جانے دے مجھے

عیسیٰ (اپنے نوکر کو سے) اب تم تو جاؤ۔ اور ان

کو بھی لیجاؤ وہیں جس جا تھے یہ

(نوکر غلاموں کو لیجاتے ہیں)

تو میں بھی ب

جولین

جانا ہوں۔

دو باتیں سن لیں میری تو سن جائیں خباب
 آہ! اس شیریں ادا لڑکی صورت نے مجھے
 کر دیا دیوانہ۔ نام اُس کا سنا ہے جس گھڑی
 جولین چو لکنا اور عیسیٰ کی طرف حیرت سے دیکھتا ہے
 سے بہت تباہ ہوں۔ بے لطف دنیا ہو نہیں
 دل کو بے اس کے قرار۔ اسکی نگہ کے تیروں نے
 ڈالے ہیں ناسور دل میں۔ ہر ادا اسکی بسی
 ہے مرے سینے میں۔ اور اسکی یہ صورت ہر گھڑی
 پھرتی ہے آنکھوں کے آگے۔ ہوتی ہے یہ بستر
 ناز پر اپنے۔ مگر یہ دل رستش کرتا ہے
 اس کی۔ ہوتی ہے یہ غافل اپنے خواب نازیں
 اور میں محراب ابرو کے مقابل بیٹھ کے
 کرتا ہوں ہر رات کو شب زندہ داری
 کل سنوں

جولین

گا۔ میں ان باتوں کو اب
 کل! کل تک آہ!
 صبر کس سے ہو سکے گا! شاہزادی اس گھڑی
 اپنے گھر جانے لگیں تو ہو گیا ہے صبر میں
 اور کڑا ماتمہ ان کا تاکہ بھیس تھوڑی دیر
 اور۔ لیکن یہ خطا تھی اس دل تباہ کی
 میں نہیں تھا اپنے بس میں
 خراب جاتا ہوں میں

عیسیٰ (حیرت سے)

(اُکٹا کے)

جولین

پھر لوں گا۔
 (جولین مریم کو لے کے جاتا ہے۔
 اے اب میں درد دل کس سے کہوں؟

عیسیٰ (خود بخود)

چل دیے دونوں ہمیں ملتی کسی سے واداس
خوں چکاں دل کی خداوند اترے لگے ہیاب
اس دل پر حسرت و مایوس کی فریاد ہے -
(غش کھاتا ہے اور پرودہ گرنا ہے)

نظم معری

سنسکرت - یونانی - لاطینی - انگریزی اور یورپ کی دیگر زبانوں میں ایک
قسم کی نظم ہوتی ہے جس میں قافیہ کی پابندی نہیں کی جاتی۔ جسے انگریزی
زبان میں "بلینک ورس" کہتے ہیں۔ یہ نظم ڈراما کے لیے نہایت ہی مناسب بلکہ
لا بدی ہوتی ہے۔ کیونکہ مکالمہ سے صحیح لطف سوا اسکے اور کسی قسم کی نظم میں
نہیں حاصل ہو سکتا۔ اس نظم میں ایک مصرع کے الفاظ ٹوٹ کے کئی زبانوں
پر جا سکتے ہیں۔ گفتگو سادی اور بے تکلف رہتی ہے اور پھر اسکے ساتھ موزونیت
کا سلسلہ بھی قائم رہتا ہے۔

اگرچہ بادی النظر میں نظر آتا ہے کہ قافیوں کی قید سے آزاد ہونے کے
باعث ایسی نظمیں لکھنا زیادہ آسان ہو گا مگر دراصل یہ سب قسم کی نظموں سے
زیادہ دشوار ہوتی ہے۔ اس لیے کہ اور سب نظموں میں الفاظ کا اپنی اصلی
اور صحیح ترتیب سے ہٹنا کسی نہ کسی حد تک جائز سمجھا جاتا ہے مگر اس میں
چونکہ مکالمہ اور بے تکلف گفتگو سے زیادہ کام لینا پڑتا ہے اور شاعری کی حقیقی
شان قائم رکھنا پڑتی ہے اس لیے اس میں ترتیب الفاظ میں ایک ادنیٰ
تغیر بھی معیوب ہے۔ یا یوں کہیے کہ تنقید لفظی سب نظموں میں تھوڑی بہت
جائز ہے مگر اس میں مطلقاً جائز نہیں۔ اور اس وجہ سے تصور کرتا کہ اس قسم
کی نظم کہنا آسان ہے بڑی فاش غلطی اور ناواقفیت کی دلیل ہے۔ بلکہ سچ یہ
ہے کہ بلینک ورس (نظم معری) ہر طرح کی نظموں سے زیادہ دشوار ہے۔
سب کے پہلے اس نظم کا سلسلہ ہم نے ولگ از میں چھیڑا تھا۔ اور

سالہ ۶ کے پرچون میں ایک ڈراما بھی شائع کرنا شروع کر دیا تھا جسکو تعلیماتہ گروہ نے باُن لوگوں نے جنھیں موجودہ مذاق سخن سے اُس نے بہت پسند کیا۔ مگر گُرائے مذاق کے شعرا میں جو اگلے رنگب انشا کے دلدادہ میں انقلاب پڑا۔ بعض نے پسند کیا اور بعض نے ناپسند۔

ایسے امور میں رے قائم کرنا کوئی آسان کام نہیں۔ انسانی طبیعت کا خاصہ ہے کہ جس چیز اور جس مذاق سے مانوس اور آشنا ہو جاتی ہے اُس کے خلاف کسی چیز اور کسی مذاق کو چاہے وہ کیسا ہی اچھا ہو نہیں پسند کرتی۔ ایک لباس ہی کو لیجیے۔ اپنے وطن کا لباس جس سے نظر مانوس ہو جاتی ہے اُس کے تمام عیوب نگاہ سے مخفی رہتے ہیں۔ ہر حیثیت اور ہر پہلو سے وہ بھلا اور اچھا معلوم ہوتا ہے۔ اور انسان جب دوسرے نکالاک اور بلاد میں جاتا ہے تو وہاں کی ہر چیز اور ہر وضع پر ہنستا، معترض ہوتا اور وہاں کے لوگوں کا مذاق اڑاتا ہے۔ جس کی بنیاد کوئی مقول بات نہیں ہوتی بلکہ صرف اُسکی نامانوسیت ہو اکر رہتی ہے۔ اور اگر ایسا نہ ہوتا تو دنیا میں یہ اختلاف مذاق و وضع ایک گھڑی کے لیے بھی قائم نہ رہتا۔ بلکہ ہر شخص دوسرے کی اچھی وضع کو جو عقل کے فیصلہ کی بنیاد پر اچھی ثابت ہوتی فوراً اختیار کر لیتا۔ اور ساری دنیا میں عجیب قسم کی یک رنگی و ہم وضعی ہوتی۔

الفرض اسی غیر مانوسیت کے باعث بہت سے یک رنگ اور قدیم پرست لوگوں نے اس نظم کو بھی جو باہر کی تھی ہونی بھی ناپسند کیا۔ اور اس پر اپنے ذہن سے تراش تراش کے طرح طرح کے اعتراض شروع کر دیے۔

ہمارے یہاں لوگ حقیقت اور معنوی امور کو چھوڑ کے لفظی سچوں کے زیادہ عادی ہو رہے ہیں۔ شاعری ہی کی دنیا میں ہم دیکھتے ہیں کہ ایک مدت دراز سے لوگ زیادہ تر اسی قسم کے مباحث اور جھگڑوں میں پڑتے ہیں کہ یہ لفظ نہ کہ ہے یا مونث۔ یہ قافیہ جائز ہے یا نہیں۔ کون سا نزاع جائز ہے اور کون نہیں۔ اسکے مقابل مضامین اور معنوی خوبیوں کی طرف شعرا کا اس قدر خیال نہیں جاتا جتنا کہ لفظی محاسن کی طرف جاتا ہے

میں یہ نہیں کہتا کہ منویٰ خوبون کا لحاظ چھوڑ دیا گیا ہے مگر ہاں یہ ضرور کوٹنگا کہ الفاظ کی ظاہری صورت سے زیادہ لحاظ اُنکے منویٰ پہلو کا ہونا چاہیے تھا اور یہ نہیں ہوتا۔ یا ہوتا ہے تو بہت کم۔

انھیں لفظی نزاعوں کے رجحان کا نتیجہ تھا کہ جب میں نے اس نظم سے بحث شروع کی تھی اُس وقت بھی یہ بحث چھڑی تھی کہ اس قسم کی نظم کو نظم کہہ سکتے ہیں یا نہیں۔ اور اب بھی اس موقع پر زیادہ بحث ہی ہو رہی ہے۔ رسالہ فیض الملوک میں اس نظم کے متعلق بہت کچھ بحث ہوئی ہے اور بعض حضرات نے بڑی قابلیت سے مضامین لکھے ہیں۔ مگر اکثر مضامین میں یہی بحث چھٹی ہو گئی ہے۔ اور مخالفین بہت زور دے رہے ہیں کہ ہلنک اس کو نظم سے تشبیہ کرنا غلطی ہے۔

اس میں شک نہیں کہ فارسی و عربی کتب عروض میں اسی قسم کے کلام کو ”شمر جز“ بتایا گیا ہے۔ مگر جن لوگوں نے فن عروض پر زیادہ دست اور غور کے ساتھ نظر ڈالی ہے اور یونانی و انگریزی محققین کے فیصلوں کو بھی دیکھا ہے وہ یہ کہنے پر مجبور ہیں کہ شاعری ایک خاص قسم کی تخیل کا نام ہے جسے قافیہ وغیرہ کی کچھ ضرورت نہیں بلکہ ایک خاص قسم کی خیال آفرینی اور خاص وضع کے طرز ادا کو شاعری کہتے ہیں نہ محض قافیہ پائی کو۔

مگر ”ہلنک“ دس کو زبان اُردو میں رواج دینے وقت اس سے زیادہ بحث کرنے کی ضرورت نہیں کہ یہ نظم ہے یا نہ۔ بلکہ اصلی بحث یہ ہونی چاہیے کہ یہ طرز کلام عام اس سے کہ نظم ہو یا نہ۔ موزون ہو یا غیر موزون۔ اُردو لطیفہ میں اُس کے اضافہ کی ضرورت ہے یا نہیں۔ یا اس سے بھی تزلزل کر کے کہا جائے کہ اس قسم کے کلام سے اُردو نظم و نثر اور ہمارے لطیفہ کو کوئی ضرر تو نہ پہنچے گا؟ اور اسی نظمیں ہماری زبان میں قابل برداشت ہیں یا نہیں؟ کسی لطیفہ میں جب کوئی نئی چیز پیش کی جائے تو پہلا تصفیہ اسی امر کا ہونا چاہیے کہ آیا ہم اس طرز کلام کو جس سے اس وقت تک نا آشنا رہے ہیں گوارا کر سکتے ہیں یا نہیں۔ کیونکہ ابتداء اُس نئی صنف سخن کی خوبون کے

بجائے صرف اُسکے چاڑھتے سے بحث کرنی چاہیے۔ رہیں اُسکی خوبیاں، وہ اُسوقت نکھلیں گی جب ہمارے مذاق اُس سے آشنا ہوں گے۔

”بلیک درس“ کے چاڑھ اور گوارا ہونے کے لیے پہلے ہمیں اس پر نظر ڈالنی چاہیے کہ اُردو لٹریچر کو اس صفت کلام کی ضرورت ہے یا نہیں۔ اگر چین جانتا ہوں کہ ہمارے قدیم مذاق کے شعرا ابھی اُسکی ضرورت کو نہ محسوس کر سکیں گے مگر مجھے یقین ہے کہ وہ روز بروز زیادہ محسوس ہوتی جائے گی۔ اور ملک میں انگریزی تعلیم کو جس قدر زیادہ رواج ہوگا اُسی قدر لوگوں کو بلیک درس کی ضرورت بھی زیادہ وضاحت کے ساتھ نظر آتی جائے گی۔

اب اُردو میں ڈراما ضرور تصنیف ہونگے۔ کیونکہ جو لوگ انگریزی میں ڈراما کا لطف اٹھا چکے ہیں وہ تا وقتیکہ خود اپنی زبان میں ڈراما کا لطف نہ پیدا کر لیں ہرگز چین نہ لیں گے۔ ایک طرف تو وہ یہ چاہتے ہیں کہ ٹیلی ویژن اور کافی داس کے ناٹکوں کا اُردو میں ترجمہ کیا جائے اور اس طرح کہ جو لطف اُنھیں اصلی زبان میں آتا ہے وہی اُردو ترجموں میں بھی آئے۔ دوسری طرف وہ چاہتے ہیں کہ اُسی عنوان پر ہمارے جذبات و واقعات کی تصویریں اُردو ڈراما میں دکھائی جائیں۔ یعنی خود اُردو میں نئے اور اور کھیل ڈراما تصنیف ہوں۔

اس ضرورت کے تسلیم کرنے کے بعد یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ہمارے تعلیم یافتہ لوگوں کا یہ شوق بغیر نظم معرّی (بلیک درس) کے رواج دیے اُردو کے موجودہ اصنافِ سخن سے بھی پورا ہو سکتا ہے یا نہیں؟ جو حضرات ڈراما کی حقیقت و حالت سے واقف نہیں وہ تو بے تکلف کہیں گے کہ کوئی خیال اور کوئی واقعہ نہیں جسے ہم اپنی موجودہ شاعری کے ذریعہ سے نہ ادا کر سکتے ہوں۔ مگر جو لوگ جانتے ہیں کہ ڈراما کیا چیز ہے وہ اس بات کے تسلیم کرنے پر مجبور ہو جائیں گے کہ نظم معرّی کے اختیار کیے بغیر اُردو میں ڈراما لکھے ہی نہیں جاسکتے۔

جو ناظرین انگریزی مذاق سخن سے ناواقف ہیں اُن پر ڈراما اور

بلیک ورس کی نوعیت کے ظاہر کرنے کے لیے میں اپنے ایک پرانے ڈراما
کا کسی قدر حصہ چند مقامات سے منتخب کر کے پیش کرتا ہوں۔
مثلاً حاکم سبطہ کی بیٹی فلورنڈا جو رادورق بدکار بادشاہ اسپین کے
محل میں ہے اور اسکی بدکاریوں سے ہراساں ہے۔ اپنے کمرے میں تنہا
بیٹھی کہہ رہی ہے۔

فلورنڈا

کس غضب میں پڑ گئی ہوں آہ! کچھ بتا نہیں!
کیا کروں؟ کس سے کہوں؟ کیونکر بچوں؟ اور کون بچ
جسکے آگے سر کوٹے ماروں؟ یہاں کوئی نہیں
جو خبر لے اس مصیبت میں مری۔ افسوس! میں
پھنس گئی کسی بل میں؟ میں تو آتی ہی نہ تھی
آہ! والد نے نہ مانا! ادھیڑے قسمت میں اب
کیا لکھا ہے؟ اور کیسی ذلتیں ہوتی ہیں؟ لے
رادورق ظالم! تجھے کچھ شرم بھی آتی نہیں!
مر نہیں جاتا ہے کیوں؟ جو تیرے ظلموں سے بچیں
لڑکیاں شاہی گھرانے اور معزز لوگوں

(کچھ آہٹ پا کے)

یا ایک جگہ اس وضع سے سین دکھایا گیا ہے کہ عیسیٰ (میر) قلعہ کے
اوپر دریا کے کنارے پہل رہا ہے اور غروب آفتاب کا تماشہ دیکھ کے کہتا ہے۔
عیسیٰ (خود بخود)

آہ! دنیا تجھ میں کیا کیا لطف ہے کس شان سے
دیکھو سورج ڈوبتا ہے اور کون کس طرح
پانی پر افشاں چھڑکتی ہیں! ادھر اس کو سہا
کو طلانی کپڑے سورج نے چھائے ہیں جہاں
گھاس کی وہ ننھی ننھی پتیاں اس دھوپ میں
جگنوؤں کے مثل تاباں ہیں۔ وہاں اس نیلے
کیا طلانی جھالیں مقیش کی لٹکانی ہیں!

پھول بھی ہر رنگ کے اُس جا کھلے ہیں۔ اور وہ
 دیکھو کلیاں سُکراتی ہیں عجب انداز سے !
 دیکھ کر یہ لطف چڑیاں کیسی خوش ہیں ! اور کس
 پوش سے سب چھا اُٹھتی ہیں ! کیسی شاد ہیں !
 جسکو دیکھو خوش ہے۔ لیکن۔ آہ ! اک میں ہوں کہ دل
 کو قرار آتا نہیں۔ کچھن ہے۔ بیانی ہے۔ اور
 ہر گھڑی اک درو ہے۔ پیاری فلورڈا تجھے
 اک نظر دیکھوں تو چین آئے۔ کہاں ایسے نسب
 میں تڑپتا ہوں یہاں۔ تو اندلس کے باغوں میں
 سیر کرتی۔ ناز سے اٹھلاتی۔ ہنستی بولتی۔
 کھلکھلاتی۔ توڑتی پھولوں کو۔ پھر انکو عجب

ناز سے سر پر لگاتی ہوگی

کچھ آہٹ پا کے اور ایک آواز سن کے

کیا ! یہ کون تھا ؟

یہ تو اظہار خیالات و جذبات کے موقع تھے۔ اب ذرا گفتگو کی شان بھی ملاحظہ ہو۔
 مریم را ورق کے دست ستم سے اُسکی ساقیہ کی مدد سے بج کے فلورڈا
 کے پاس آئی ہے۔ وہ ساقیہ بھی موجود ہے اور مریم محل سے بھاگنے کا قصد
 کرتی ہے۔ اُسوقت تینوں عورتوں میں یہ گفتگو ہوتی ہے۔

مریم (افق مشرق کو دیکھ کر) صبح اب ہونے کو ہے

دیکھیے جھونکے نسیم صبح کے۔ وہ آپ کی

زلف پر ہم کر رہے ہیں۔ اور تارونکے چراغ

جھللاتے ہیں فلک پر۔ اور سیہ چادر شب

کی مسکتی جاتی ہے۔ انیسانہ ہو چڑیاں اٹھیں

اور جگا دیں را ورق کو۔ میں تو جاتی ہوں بہن

کیا کرو گی جا کے اب ؟

فلورڈا -

ساقیہ

فلورنڈا

ساقیہ

ان کو نہ روکیں
کس لئے
بادشہ کو گروڑا بھی شک ہوا تو بس مجھے
اور ان کو قتل کر ڈالیں گے۔
تو جاؤ ہن۔

مریم

فلورنڈا

اب کہاں جاؤ گی تم
جس جاؤ لیجائے
تم

ساقیہ

مریم

فلورنڈا

کس طرح جاؤ گی یاں ہے؟
خاک راقی۔ ٹھوکریں
کھاتی۔ تنگے پاؤں جاؤ گی ہن۔ اور جس طرح
بن پڑے گا۔ آپ کو پہونچاؤں گی نروبہن میں
کیوں نہیں جاتی ہو سبط میں؟ جہاں آرام سے
قصر میں اپنے پھوپھا کے زندگی بھر رہ سکو۔
خیر جاؤں گی وہیں۔

لیکن وہاں تو ان دیوں
ہو گی پوش کا فروں کی ہر طرف۔ اور کوئی شخص
جانہ سکتا ہو گا اندر شہر کے
میں جاؤ گی جیسے بنے۔

مریم

فلورنڈا

مریم

فلورنڈا

تو مر اسب حال کہدینا۔

ضرور

اور یہ کہ اب۔

مجھ کو جلدی دیاں بلا لیں

مریم

لو خدا حافظ بہن!

(چلی جاتی ہے)

ہمارے اس ڈراما کے چھ سین ۱۹ء کے آخر اور ۱۹۰۱ء کی ابتدا میں دگلڈا کے صفحوں پر شائع ہوئے تھے۔ پھر اسکے بعد فوبت نہ آئی۔ اور یہ ڈراما ناما تمام بڑا رہ گیا۔

اس موقع پر اسکے ان چند ٹکڑوں کو سخن سجان ملک کے سامنے پیش کر میں دریافت کرتا ہوں کہ متغی نظموں میں یہ خیالات اسی عنوان اور اسی نثرنا ترتیب سے ادا کیے جاسکتے ہیں؟ اور باہمی گفتگو میں اسی طرح کی سادگی کے ساتھ بھرتی کے الفاظ سے بچنا ممکن ہے یا نہیں؟ میرا ذاتی خیال ہے کہ نہیں ہے۔ اور پھر اسکے ساتھ اس کا بھی خیال کیا جائے کہ اب اردو کو ڈراموں کی ضرورت ہے۔ ایسی حالت میں سوا اسکے کہ اس قسم کے کلام کو عام اس سے کہ آپ اسے نظم معرے کہیں یا نثر مرتبہ اردو میں رواج دیا جائے اور کیا کیا جاسکتا ہے؟

شعرائے اردو سے یہ نہیں کہا جاتا کہ آپ غزل کوئی اور قصیدہ خوانی کو موقوف کرویں۔ یہ بھی نہیں درخواست کی جاتی کہ شویان نہ لکھی جائیں۔ نہ یہ خواہش کی جاتی ہے کہ وہ آئندہ قطعات و رباعیات یا نحیں و مسدس نہ کہیں۔ وہ اس پر بھی مجبور نہیں کیے جاتے کہ خواہ مخواہ اس قسم کی نظم معری وہ بھی کہا کریں۔ پھر میں نہیں سمجھ سکتا کہ نزاع کس بات کی ہے؟ اہتہاے مافی الباب یہ ہے کہ اگر کوئی انگریزی مذاق اور جدید رنگ کا دلدادہ اس قسم کی نظمیں شائع کرے تو جن حضرات کو وہ ناپسند ہوں وہ انھیں ملاحظہ کریں۔ چھٹی ہوئی۔

بلنک درس میں جب عروض کی بحر وں کی پوری طرح پابندی کی جاتی ہے تو اسے غیر موزون ہرگز نہیں کہا جاسکتا۔ زیادہ سے زیادہ جو کچھ کہا جاسکتا ہو اسی قدر ہے کہ نظم کے جن اصناف سے ہم آشنا ہیں یا جن کو اگلے دنوں ہم نظم کہا کرتے تھے انکے طے سے یہ انوکھی نظم خارج ہے۔ ورنہ صرف قافیے کے نہ ہونے سے اس وضع کے اشار کو غیر موزون کہنے کی کوئی وجہ نہیں ہے۔ زمانے کی پیشین گوئی ہے کہ اس قسم کی شاعری کو اردو میں رواج ہوگا۔

اور آئندہ بڑے بڑے نازک خیال شعرا اس رنگ میں طبع آزمائی کریں گے آپ
چاہے منظور کریں یا نہ کریں یہ ہونے والی چیز ہے۔ اور
مگر نہ ستانی بہ ستم می رسد

نظم معری

جون سلسلہ کے دگداز میں ہم نے نظم معری پر ایک مضمون لکھا تھا جس میں اپنے ایک موزون ڈراما کے چند حصے بہ طریق نمونہ دگداز کی سابقہ جلدوں سے نقل کر کے پیش کیے تھے۔ اور اردو شعرو سخن کا ذوق رکھنے والوں کو آمادہ کیا تھا کہ اس طرف توجہ کریں۔ کیونکہ یہ نظم گو اسے بعض لوگ ناپسند کرتے ہوں یا بعض اسے نظم ہی نہ سمجھتے ہوں مگر ایسی نہیں ہے کہ بے پردائی سے چھوڑ دی جائے۔ کیونکہ بغیر اس کے اختیار کیے اردو زبان میں ڈراما کے فن کو ہرگز ترقی نہیں ہو سکتی۔

اسکے بعد چارویں نظر سے مارچ سلسلہ کا رسالہ "نیرنگ راہ پر گزرا" جس میں جناب شادوان لکھنوی نے اس نظم پر بڑی قابلیت اور تحقیق سے بحث کی ہے۔ اور ثابت کر دیا ہے کہ اسے نثر مزج کہنا غلطی ہے بلکہ دراصل یہ نظم ہی ہے۔ اور اردو دووان پہلک کو اُن کا شکر گزار ہونا چاہیے کہ انھوں نے ایک بہت بڑی غلطی دُور کر دی۔ اور ان کی تحقیق کی بنا پر ہم اب اطمینان کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ یہ نثر مزج نہیں بلکہ نظم معری ہی ہے جس نام سے کہ دگداز میں یہ نظم دس سال پیشتر سے یاد کی جا رہی تھی۔

جون کے دگداز کو ملاحظہ فرما کے متذکرہ دوامان دگداز نے اس کو بہت پسند فرمایا۔ اور تاکید شروع کی کہ ہم اُس ڈراما کو پورا کریں۔ اور دگداز میں نظم معری کا سلسلہ برابر جاری رکھا جائے۔ اُن کی خواہش کے مطابق ہم اپنے اُس فتح اندس کے ڈراما کو بھی پورا کر دیں گے۔ لیکن سردست ایک نیا مختصر تاریخی ڈراما جو صرف دو سینوں میں ختم ہو گیا ہے موزوں کر کے نذر

ناظرین کرتے ہیں۔

یہ ڈراما رومنہ الکبریٰ کی تاریخ قدیم سے ماخوذ ہے۔ روم میں دو گروہ تھے ایک بطریق لوگ (پیٹریشن) یعنی امراء معززین۔ اور دوسرے عوام الناس (پلی بین) ان دونوں گروہوں میں اپنے اپنے حقوق کے لیے اکثر نزاع رہا کرتی تھی۔ چنانچہ انہیں جھگڑوں کے دور کرنے کے لیے مستقیم میں وہاں یہ نیا طریقہ حکمرانی جاری کیا گیا تھا کہ دس محسٹریٹ منتخب کیے گئے اور حکومت کے پورے اقدارات ان کے ہاتھ میں دیدیے گئے یہ محسٹریٹ وہاں دسھم ویر کے لقب سے یاد کیے جاتے تھے۔ وہی برس یہ انتظام رہنے پایا تھا کہ آپوس فلا دیوس نام ایک شریہ لفسٹریٹ سویر کی بدعاشی سے ایک ایسا شرناک واقعہ پیش آیا جس سے ہنگامہ ہو گیا۔ اور سلطنت کو مستحکم قیام میں دسویرون کے تقرر کو منسوخ کر کے پھر اپنا پرانا انتظام جاری کر دینا پڑا۔ وہ واقعہ کیا تھا؟ اس کا حال ناظرین کو ہمارے اس ڈراما کے پڑھنے سے معلوم ہو گا۔ جس کا عنوان ”مظلوم ورجینا“ ہے۔

مظلوم ورجینا

(۱)

فریم۔ یعنی عدالت گاہ رومنہ الکبریٰ میں دسویرون آپوس کا اجلاس۔
اور سامنے بویب ایک صاحب غرض مقدمہ والا لائجنینوس کھڑا ہے۔
آپوس (کبر و نخوت سے) بڑا جھگڑے مدتوں کے بعد اب حاصل کیے
ہیں حقوق اپنے۔ کہاں آزادیاں یہ پہلے تھیں؟
پہلے میں تھا اک غریب اونٹنی سپاہی۔ آئی ہوں
حکمران روم۔ اب وہ کون ہے جو چار آنکھ
کمرے میرے مقابل؟ یا کہ ہمارے حکم سے؟
ہے بجا ارشاد حضرت کا (دوبے) لائجنینوس

آپوس (زیادہ اکر کے)

حقیقت کچھ نہیں
 سامنے میرے ہے ان بھرتیوں کی - جو ظلم پر
 ظلم کرتے - اور غلام اپنا سمجھتے تھے غریب
 رومیوں کو - اب بڑے مالوں گامیں قانون وہ
 جس سے ہوتا ظلم تھا - اور کھائے جاتے تھے ہیر
 روم کے مفلس غریبوں کو

لاجنینوس

آپوس (دلا پروائی سے)
 سب ڈسمیروں کو کر لیں بھجیاں اپنا کہ جب
 پیش ہو پسند تو ساتھ دیں سب آپ کا -
 سب موافق مجھ سے ہیں - سب عقل اور تدبیر سے
 میری دیتے ہیں - نہیں دیتے ہیں مجھ سے بس وہی
 ہو گا جو کہدوں گامیں - تم کیا سمجھتے ہو مجھے؟
 (دونچھون پڑاؤ دیکے)
 بادشاہ روم ہوں میں - سب مے اتھ ہیں -
 تو مبارک یہ خروج

لاجنینوس

(دور جینا ایک خوبصورت لڑکی سامنے سے گزرتی ہے)

آپوس (درجینا پر نگاہ شوق ڈال کے)
 این! کیسی مد پارہ ہے یہ!
 کیسی گل اندام ہے! کیسی حسین و نازنین!
 ماہ سیما! ہروش! چاکر خرام! اور گلبدن!
 کوئی لڑکی مدرسے جاتی ہے پڑھنے کے لیے -
 جانے دیجے -

لاجنینوس (دُور دیکے)

آپوس
 کیسے جانے دوں؟ بہت تیار ہوں!
 دل مرا چھینے لے جاتی ہے! لینا! دوڑنا!
 روکنا! بچانے نہ پائے!

آپوس

یہ برا ہو گا حضور!
 سب گڑبھیس گے رومی - اٹھ کھڑا ہو گا فساد -

لاجنینوس

آپیوس (سخت بیباکی سے)

مجھ کو کیا پروا کسی کی! کون ہے؟ جو سرکشی
کر سکے گا؟ تم کپڑا اسی دم اسکو پاؤں۔
گر کوئی روکے تو کیا اس سے کہوں؟
اُنہم کیا فضول

لاجنینوس
آپیوس

باتیں کرتے ہو؟ یہ کہہ دینا کہ یہ تو بیٹی ہے
میری لوتھی ہے۔ مری ملک ہے۔ مالک ہوں میں
روکنے کا حق کسے ہے؟

اں لیگا کون اس

جھوٹ کو؟

لاجنینوس
آپیوس (بگڑ کے)

کیونکر نہ مانے گا؟ تمہاری باتوں میں
وہ ہونچ جائے گی اپنے در سے۔ رہ جاؤں گا
میں کلیجہ بے انتہام کے۔ جاؤ! کپڑا لاؤ! نہیں
تو میں مر جاؤں گا اُسکے شوق میں۔

جاتا ہوں میں۔

لاجنینوس

(عدالت سے نکل کے دوڑتا ہوا چلا جاتا ہے)

سچ تو یہ ہے میں بڑا ہی خوش نصیب۔ اقبالند۔

نیک طالع۔ ذی مراتب۔ صاحب توقیر ہوں

اک تو ہے ایسی حکومت۔ ایسی قدر و منزلت۔

اور ایسی شان و شوکت۔ ساتھ اُسکے چہرے

جب بغل میں میرے ہو گئی تے مانے میں کوئی

شمانی ہوا اقبالندی میں مرا۔ ممکن نہیں۔

مجھ کو کیا پروا کسی کی؟

(لاجنینوس درجینا کو کہینچتا ہوا لاتا ہے)

لیجیے حاضر ہے یہ۔

کون ہے؟ اور کس لیے لائے ہو اسکو؟

لاجنینوس
آپیوس (اتکھ مار کے)

و برجنیا (چلا کے اوٹل مچا کے)

سے حضور!

میں تو اپنے مدرسے جاتی تھی پڑھنے کے لیے

یہ زبردستی پکڑ لایا مجھے - فریاد ہے!

دوڑو اسے میرے عزیزو! اور کرو میری مدد!

پھنس گئی ظالم کے پھندے میں ہوں! اور مظلوم ہوں!

اور جنیا کا چچا نیومیٹورپوس - اور اقبلیوس جسکے ساتھ اُس کی

نسبت ٹھہری ہے پاپتے ہوئے آتے ہیں)

نیومیٹورپوس (طیش غصے) آہیں! بھینچی میری!

اقبلیوس (بیاب ہو کے) مشفقہ مری! جس سے مری

شادی ہونے والی ہے!

نیومیٹورپوس (توڑ کپکنج کے) کس نے اسے چھڑا ہوا؟

جان لے ڈالوں گا میں اُسکی اسی دم

اور میں -

اقبلیوس

خون پی لوں گا اسی دم اُس کا

حضرت - تو ہے

اک مری لونڈی کی بیٹی - جسکو پیدا ہوتے ہی

مان نے بجا پری سے اپنی دیدیا تھا پالنے

کے لیے اس شخص کو - اب میں وہیں لیتا ہوں

کیا کسی کو دخل اس میں؟ یہ ہے میری ملکیت

کیا جواب اس کا تھا رسے پاس ہے!

آپوس (نیومیٹورپوس سے)

نیومیٹورپوس (حیرت زدہ ہو کر)

جانتا ہوں اسکو - بچن سے - یہ میرے سامنے

بھائی کے گھر میں ہوئی پیدا - وہیں پھر کیل کے

یہ ہوئی اتنی بڑی

ہے کچھ ثبوت اس کا بھی ہے!

آپوس

نیومیٹورپوس

دعویٰ ہی دعویٰ ہے خالی
تو بلا بھیجوں گا میں
باپ کو اسکے جو فوج روم کا سنٹورین
ہے۔ وہی دے گا ثبوت۔

آپوس

اُسکو بلاؤ جلدیاں
ایک ہفتے میں کرے وہ آگے پیش اپنا ثبوت
تو رہے جب تک یہ میرے پاس
یہ ممکن نہیں

لاجنیوس
اقلیوس (دھواں کینچ کے)
آپوس (دل میں ڈرنے کے)
نیومیٹورپوس

خیر تم ہی اسکو لے جاؤ۔ مگر یہ شرط ہے
یہ حفاظت سے رہے۔ اور آج کے ہیں روزیہ
لا کے حاضر کرو اس اجلاس میں۔ اور ساتھ ہی
پیش کرو اپنے دعوے کے ثبوت۔ اور وہ جسے
باپ اسکا ہوئے گا دعویٰ ہے حاضر ہو کے وہ
پیش دعوے کو کرے اپنے۔ کہ اس بارے میں جو
ہو گا حق حق وہ ہی میرا فیصلہ بھی ہو گا۔ اور
حاضر میں تم نے غفلت کی تو اتنا جان لو
فیصلہ یک طرفہ ہو جائے گا قطعی پھر مرا
مکمل ناطق ہو گا جو ہو۔

نیومیٹورپوس

مذہب ہم کو کیا بھلا؟
ہوں گا حاضر لے کے سب اپنے ثبوتوں کو مزور
(نیومیٹورپوس اور اقلیوس ورجینیا لوئے کے جاتے ہیں)
(لاجنیوس دوسری طرف جاتا ہے۔ اور عدالت پر حاضرت)

(۲)

وہی مقام ہے۔ وہی اشخاص ہیں۔ اور انکے علاوہ مرقیادوٹری ماں

سیاہیوں کا افسر یا جمنسب کیسے دیکھتا ہو۔

ہونے کی مدعیہ - ورجینیا کا باپ اور اسکی ماں وغیرہ حاضر ہیں۔
 آپوس (لائجنیوس سے) تم کو دعویٰ ہے کہ ہے ورجینیا بیٹی کسی
 لونڈی کی جو ہے تمہاری باک؟

لائجنیوس

جی بیشک حضور

یہ مری لونڈی کی لڑکی ہے۔

آپوس

نبوت اسکا بھی کچھ

رہ کھتے ہو؟

لائجنیوس

حاضر عدالت میں ہر خود میری کینز

جو ہے ماں ورجینیا کی۔

آپوس

آئے میرے روبرو

اور شہادت دے۔

لائجنیوس

وہ حاضر ہے۔

(مرقا لونڈی آ کے کھڑی ہو جاتی ہے)

تمہارا نام

آپوس
مرقا

میں

لونڈی ہوں۔ یہ میرے آقا ہیں۔ مرزا مائے حضور
 مرقا ہے۔

آپوس ورجینیا کی طرف اشارہ کر کے) جانتی ہو اسکو تم؟

جی ہاں۔ مری

بیٹی ہے یہ۔ جبکہ یہ پیدا ہوئی تھی۔ اُن دنوں

میں بہت بیمار اور تکلیف میں تھی۔ اس لیے

دے دیا تھا۔

ورجینیا کی طرف اشارہ کر کے)

ان کی بی بی کو کہ پالیں وہ اسے۔

دی نہیں اولاد تھی انکو خدا نے۔ اور وہ

آرزو اولاد کی رکھتی بہت تھیں۔ الغرض

لے کے پالا میری بیٹی کو۔ گریب کرتی ہیں
اس سے انکار۔ اور کہتی ہیں کہ یہ اُنکی ہی
پیٹ کی۔ مجھ سے چھڑاتی ہیں مری اولاد کو۔
اور گواہ اس کا ہے کوئی؟

آپویں
مرفیاء

میرے آقا ہیں گواہ
اور بھی ہیں جاننے والے۔ مگر وہ آج کل
دوم کے باہر گئے ہیں۔

ہے تمہارا کیا بیاں؟

دیکھو سچ کہنا۔

آپویں (درجنیوں سے)

یہی مُردار چھوٹی ہے حضور۔

درجنیوں (برہمی سے)

گالیاں مت دو۔ یہاں تم ہو کہ وہ ہو۔ کوئی ہو۔

آپویں (روک کے)

سب برابر ہیں عدالت ہے یہ۔ اور حاکم ہوں میں۔
میں نہیں اسکا روادار اک گھڑی کو بھی۔

درجنیوں

حضور!

میرے گھر میں اور میرے سامنے پیدا ہوئی۔

پھر اے پالا بہت لڑے۔ جانتے ہیں اسکو سب۔

دوست۔ احباب۔ اور خلع والے۔ اور میرے عزیز

سب شہادت دینے کو موجود ہیں۔ شک بھی بھلا

اس میں ہو سکتا کسی کو ہے! ہوئی پیدا یہ جب

لوگ جتنے خاندان میں ہیں سبھی موجود تھے۔

اسکی ماں۔ والی (جنایا جسے)۔ گھر کی لونڈیاں

وہ پلا یا دو دھ جس نے۔ اور کھلائی۔ الغرض

سیکڑوں ہی عورتیں موجود تھیں۔ جو جانتی

ہیں کہ ہے درجنیا بیٹی ہماری۔ سب حضور

دیں گی یاں اگر گواہی صاف صاف

سفین نثر

آپوس

ورجینیوس

آپوس

ورجینیوس

آپوس

ورجینیوس

آپوس

ورجینیوس

۷۵

نظم و ڈراما

اب تم فضل

باتیں کرتے ہو۔ مگر اس لٹو گئی سے کہیں
کلام نکلا ہے؟ بھلا دیکھا کسی نے آنکھ سے
اسکو پیدا پیٹ سے ہونے بھاری بی بی کے؟
دامی حاضر ہے جنایا جس لئے تھا۔

کیا اعتبار

ایسی ادنیٰ عورتوں کا؟

اور بھی ہیں

وہ بھی سب

جھوٹ بکتی ہونگی۔

اس سے شبہ ہوتا ہے

ہے عدالت کو نہیں ہمدردی ہم سے۔

اس جگہ

سب برابر ہیں۔ نہیں ہمدردی حاکم کو کسی
سے۔ جو ہوا فرض تو دونوں فریقوں کو اُسے
دیکھنا یکساں نظر سے چاہیے

یہ ہے سب!

لیکن اس بارے میں حضرت غور فرمائیں ذرا
کون دے دے گا بھلا اپنی پیاری۔ لادٹی۔
بیٹی کو آسانی سے؟ جو ہے اُجالا گھر کی۔ نور
آنکھوں کی۔ ٹکڑا جگر کی۔ چین سکھ ماں باپ کی
کون سا وہ خانہ اس ہوگا۔ جو اتنا بے حیا
بے حمیت ہو کہ جھین جاتے پہ اپنی لڑکی کے
صبر کر لے؟ اور خاموشی سے ایسے ظلم و چور
کو گوارا کر لے؟ ہوگی سخت خونریزی! بڑا

بلوہ ہو گا! تڑپاں خوں کی بہیں گی! اور جب
ہم نہ ہوں گے تب کوئی درجنیا کو پاپ اور
ماں کے آغوشِ محبت سے چھڑانے گا!
نہیں!

اقیلیوس

سیکڑوں جانیں فدا درجنیا کے نام پر
ہونگی! اسے جانیئے اس جھکڑے میں دونوں وطن!
وہ بھی جو چھینے گا! وہ بھی جسکے وہ آغوش سے
چھینی جائے گی! پھر اُسکے بعد وہ بھی جو اسے
کھینچنا چاہے گا اپنے شوق کے آغوش میں!
کچھ نہیں آساں ہے یہ!

آپیوس (گڑگڑے)

کون ہے یہ؟ جو کہ ہے
ڈاکٹر میری عدالت اور حکومت پر دباؤ
جکو اندیشہ اسی کی ذات سے بلوے کا ہے
اور نظر آتا فساد می ہے مجھے۔

نیومیٹیویس (اقیلیوس کو دکھاتے)

مت بولو تم!

(آپیوس سے)

آپیوس (گڑگڑاتے)

ہو نظر انصاف کی اس بارے میں

یعنی کہ تم
غیر منصف جانتے ہو جھکو؟ لیکن میں کبھی
درگزر حق سے نہیں کرتا۔ طرفداری کسی
کی کروں یہ جرم ہے۔ اور میری نسبت یہ خیال
جو کرے تو ہن کرتا ہے عدالت کی۔ گوارا
یہ نہیں ہو سکتا تھا ہرگز۔ مگر خیر۔ اب سنا
تم کو کرتا ہوں۔ مگر حق سے قدم میرا ہٹے
غیر ممکن ہے۔ سنا اب فیصلہ:- میری نظر
میں سراسر زیادتی تم لوگوں کی ہے۔ مرقیا

حق پہ ہے۔ تم شورہ پشتی اور اپنے زور سے
چاہتے ہو چھین لو۔ اولاد اُسکی۔ اور کمر و
اُسکو محروم اُسکی بیٹی سے۔ لہذا میرا حکم
ہے کہ پائے مرقیا ورجینیا کو جو کہ ہے
مستحق پائے کی اُسکے۔ اور تم سب باز آؤ
اُسکے دعوے سے۔ ہوئی گر کچھ بھی شورش تو سزا
تم کو دی جائے گی۔

ورجینیا (درو کے)

اب ورجینیا کو میں کہان
اپنی پاؤں گا؟ کہاں جگو ملیگی؟ ہاے اہاے اہاے
ایسی پیاری بیٹی! یوں چھین جائے اہمت پھٹ جائے
ہاے بیٹی! کیا خبر تھی جیتے جی تجھ کو کوئی
چھین لے گا تجھ سے! تیری! دیں میں ہر طر
سکتی۔ تنکے چنتی۔ خاک اُڑاتی! اور ہاے!
خون کے آنسو بہاتی! در بدر کی ٹھوکریں
کھاتی۔ ہر جانب پھرونگی۔ اور نپاؤنگی تجھے!
گھر میں یوں تسوے بہانا!

ورجینیا کی مان

آپس (ڈپٹ کے)

(ضام اجلاس سے)

اب نکالو یاں کے ان

لوگوں کو جو شور کرتے ہیں۔

(عام حاضرین میں سخت برہمی پیدا ہوتی ہے اور سب لوگ رو رہے ہیں)

ورجینیا (دست سے)

حضور اب چھٹی ہو

میری بیٹی۔ مجھ سے تو اتنی اجازت ہو کہ میں
خصتی بوسہ لوں اُسکا۔ اور لگاؤں چھاتی سے۔
گرچہ میں یہ کر کی باتیں۔ مگر خیر۔ اب بار
کے لیے تم کو اجازت ہے۔

آپس

ورجینیا (خطرناک جوش حسرت سے)

میری ورجینیا!

(اور جنینوس ورجینیا کو گلے لگاتا ہے۔ دونوں روتے ہیں۔ ورجینوس
اس کی پیشانی چومتا ہے۔ پھر اپنے رومال سے اُسکے آنسو پونچھتا ہے)
تجھ سے شفقت زندگی بھر کے لیے۔ یہ آخری
تیرا ہے دیدار۔ مت رونا قائمہ اس رونے سے
جلد ہو گا خاتمہ اس رنج اور اندوہ کا۔
گلے لگائے ہی لگائے اُسے ایک قسائی کی دوکان کے پاس
کپینچ لے جاتا ہے جو سامنے ہی ہے)

اب بچانے کی مجھے بے آبرو ہونے سے ہاں
میری پیاری لاڈلی بیٹی نہیں دنیا میں ہے
کوئی تدبیر۔ ایسی جو ہو وے شرافت کے اصول
کے موافق۔ بس سواا سکے۔

(دکان سے ایک چھری جھپٹ کے اٹھا لیتا ہے اور ورجینیا کے سینے
میں بھونک دیتا ہے۔ زخم سے خون کا فوارہ نکلتا ہے۔ لڑکا کی
گرتی اور تڑپ کے جان دے دیتی ہے)

آپہوں (گھبرا کے)
ورجینوس (جان سے ہاتھ دھو کر)

کیا؟ ظالم یہ کیا؟
وہ جو کرتا ہر شریف ایسے محل پر! ہاں یہی!
آبرو دیزی سے بچنے کی یہاں تدبیر ہے!
جس جگہ حاکم ہو ظالم! سنگدل! کم ذات! اور
بد گھر! جس کو شرافت اور نجابت سے نہ ہو
کچھ بھی مس! ایسی جگہ جینے سے بہتر موت ہی!
اب نہیں بچنے کی عزت روم میں! بے خطرے میں
آبرو!

قلیوں (شور کر کے)

بہت سے لوگ جمع ہو جاتے ہیں)

لوگ (دغل مچاتے ہیں)

مار دینا لو! ان ڈسویروں کو! جو
دشمن عزت ہیں! ساری قوم کے بد خواہ ہیں!

آپوس پر ہر طرف سے پوش ہونے لگتی ہے۔ اور آخر کار وہ درکے
اپنا اجلاس چھوڑ کے بھاگ کھڑا ہوتا ہے)

درجنیوس (جوش سے) لو وہ بھاگا! بڑی ظالم کی دیکھو! جس سے صاف

ہوتی ظاہر اسکی بے ایمانی ہے۔ اچھا کہاں
ہے وہ لاجینیوس؟ تھا جو مدعی؟

لوگ اُسے دھونڈھد کے پکڑ لاتے ہیں

لوگ (دھمکاتے)

سچ سچ بتا؟

کیا تھی یہ درجنیا بیٹی تری لونڈی کی؟

لاجینیوس

مین

اُس سے واقف بھی نہ تھا۔ وہ اتفاقاً ایک روز

جاتی اپنے مدرسے تھی اس طرف سے آپوس

دیکھتے ہی اُس پر عاشق ہو گیا۔ مجھ سے کہا:

تم پکڑ لاؤ اُسے۔ مگر کوئی روکے تو کہو

بہی ہے یہ میری لونڈی کی۔ پھر اپنی چھوڑی

مرقا کو خود سکھا کے بھیجا اُس نے میرے پاس۔

تاکہ اپنی لونڈی کہہ کر میں اُسے اجلاس میں

پیش کر دوں۔

ایسا ظالم!

لوگ (جوش سے)

اقیلیوس

اور کہاں ہے مرقا؟

(اُسے بھی لوگ پکڑ لاتے ہیں)

ہاے مجھ کو چھوڑ دو۔

مرقا

اقیلیوس (تلوار کھینچ کے)

(سم کے)

جلدی بتاؤ کون ہے؟

آپوس آتا ہیں میرے اوپر انکی لونڈی ہوں۔

جانتی بھی میں نہ تھی درجنیا کو۔ اُن کے حکم

سے کیا دعویٰ کہ وہ بیٹی مری ہے۔

مجنوناہ طیش سے

پھونک دو

اس عدالت کو! جہاں اسی دغا بازی سے اوڈ
ایسی بے ایمانی سے ہوتی ہو حکومت!

عام لوگ (جو خوش سے)

ہاں ابھی!

پھونک دو اجلاس یہ! اور کھو ڈالو یہ مکاں!

مار ڈالو سب ڈسمیروں کو! پائے تاکہ روم

اب نجات ان ظالموں کے ظلم سے اور جو سے

دروم میں آگ لگاتے ہیں۔ اور شہر میں بلوہ ہو جاتا ہے۔

اسیری بابل

تخت نصر سارے بنی اسرائیل کو اسیر کر کے بابل کیڑے لگیا تھا۔ ان کے
بادشاہ صدقیا کو طوق و سلاسل پہنائے۔ اُس کے بیٹوں کو اُس کے سامنے
قتل کرایا۔ لوہے کی گرم سلاخوں سے اُس کی آنکھیں پھوڑیں۔ اور اُسے باپل
کے تیرہ و تار قید خانہ میں ڈال دیا۔ پھر اہل بابل یعنی کلدانی بت پرست بنی ہر اہل
سے بنی اسرائیل سے غلاموں کی طرح محنت و مشقت کے ذیل ترین کام لینے
لگے۔ اور اس حالت کو بدیں گزر گئیں۔ یہاں تک کہ اسرائیلی بادشاہ صدقیا
قید میں مر گیا۔ اور اُس کے مرنے کے بعد فارسی تاجدار سائرس نے حملہ کر کے
کلدانیوں کو تباہ اور بابل کو ویراں و بے چراغ کیا۔ اور بنی اسرائیل کو اپنے
وطن ارض یوذا میں واپس آنے کی اجازت دی۔

یہ واقعہ دنیا کے اہم ترین تاریخی واقعات سے ہے جس کے حالات کتب
آسمانی سے معلوم ہوئے ہیں۔ انگریزی کے جادو بیاں و نکتہ سنج شاعر گوگولڈ اسمتھ
نے انہیں مذکورہ واقعات سے ماخوذ کر کے ایک چھوٹا سا دلچسپ منظوم ڈراما لکھا جو
جس سے تاریخ قدیم کا ذوق رکھنے والوں خصوصاً دلدادگان شریعت الہی و

مرثیہ شامان اسرار پیغمبری کو بڑا لطف آسکتا ہے۔ اور مسلمان چونکہ تو حید کے عقیدے میں سب سے زیادہ بڑھے ہوئے ہیں اور انہی کے سلف کا بے حد ادب کرتے ہیں اس لیے ہمیں امید ہے کہ اُن کو اس ڈراما میں یہود و نصاریٰ کے زیادہ مزہ آئے گا۔

اسی خیال سے میں نے اس چھوٹے سے ڈراما کا ترجمہ اردو نظم میں کر دیا اور ان پابندیوں کے ساتھ کہ اصل مضامین بحسبہ قافم رکھے ہیں۔ ترجمہ کو یہی ہی نظم میں ہے جیسی کہ گوئڈ اسمتھ نے لکھی ہے۔ اصل ہی کی طرح شعر خوانی ہے۔ نئے ہیں۔ اُسی نمونے کے اشار ہیں۔ اُسی شان و ترتیب سے قافیہ ہیں۔ اور وہی رنگ ہے۔ خلاصہ یہ کہ فقط الفاظ تو اردو ہیں باقی ہر چیز انگریزی ہے مجھے یقین ہے کہ اس ڈراما کو بھی ہی خواہاں اردو عموماً اور مسلمان خصوصاً پسند کریں گے۔ قدرو اتان دگداز۔ اس تمہید کے بعد اب آپ اس ڈراما کو ملاحظہ فرمائیں۔ اور دیکھیں کہ یہ ڈراما کیسے مورخانہ و قاری۔ مذہبی استقلال۔ موجدانہ جذبات اور ادیبانہ کمالات کو ظاہر کر رہا ہے۔

خاکسار محمد عبدالحلیم شری ایڈیٹر دگداز

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اشخاص ڈراما

پہلا کلدا نی پوجاری

دوسرا کلدا نی پوجاری

کلدا نی عورت

نوجوان مردوں اور دوشیزہ لڑکیوں کے گروہ

پہلا اسرائیلی نبی

دوسرا اسرائیلی نبی

اسرائیلی عورت

پہلا کھیل

(منظر: دریا کے فرات کے کنارے۔ قدیم شہر بابل کے قریب)

پہلا نبی (شعر خوانی) اسیرانِ ستم - جو کام کرتے کرتے روتے ہو
 فرات تیز زو کا شور سنتے ہوں کھوتے ہو
 ذرا اس گریہ و زاری کو چھوڑو اور دم لے لو
 خدا سے لو لگا کر دل کو اک تسکین سی دے لو
 ذلیل و پابِ زنجیر - اور دنیا بھر عدو اپنی
 خدا ہی کہے ہاتھ اب تو امید و آرزو اپنی

وہی (نغمہ)

خدا ہی ہے نازِ ہم کو زمین پر
 اُسی کے کرم پر لگی ہیں نکلا ہیں
 مصیبت بڑھے جتنی قلبِ حمز پر
 بڑھے حوصلہ بھی کہ اس کو بنا ہیں

دوسرا نبی (نغمہ)

نہیں گو کہ آراستہ وہ حرمِ یان
 نہ قربانیاں اور چڑھاوے ہیں اس جا
 بنے گا حرمِ اُس کا سینے میں ہر آن
 اور اُس پر دُرُ رشک ہر دم چڑھے گا
 پہلے ننھے کو اسرائیلی مل کر پھر گاتے ہیں

اسرائیلی عورت (شعر خوانی) یہ نغمہ پھر سناتا - جس سے گھر یاد آتا ہے اپنا
 کہ نقشہ کھینچے ان آنکھوں کے آگے اپنے موطن کا
 زیوں کے مرغزار و باجواؤں سے پھولوں کی چاد
 وہ کھیت و باغ و ملک و قدروں ہے لچکا جتنے دامن پر
 چھاڑو! ارضِ لبنان کے! ہے جن پر تاجِ سرودن کی
 درخت و لیموؤں کے! جیسے سارا بن ہلک اٹھا
 تھے کیسے جانفزا یہ جھنڈا کیسے پیارے میدان تھے
 خصوصاً جبکہ ہم سب سرورِ الطافِ رحماں تھے
 یاد و وطنِ بفریب نہ دے بن کے ہر باں
 بے سود و بے نتیجہ ہے ہر وقت ہر گھڑی

وہی (نغمہ)

پیش نظر ہی رکھنا گذشتہ سروریاں
 پھر رنج سے بدل کے اُسے کرنا دشمنی
 ظالم ستانے والی اہواں جا جہاں کہ سب
 آزاد اور مست شراب سرور ہوں
 کجبت ہم سے جو کہ ہیں خواہاں فضل رب
 کیا تھرے کہ وہ ترے زخموں سے چور ہوں
 مگر کیوں شکوہ؟ گر طوق و سلاسل ہیں تو کیا پروا
 دلوں کے جوش پر بھی کیا ہواں سب قید نگاہ پروا
 ہماری شادمانی کے لیے کیا یہ نہیں کافی؟

وہی (شعر خوانی)

کہ یاں ہیں بت پرستی سے بچے رہتے قطع ہم ہی؟
 ہے آغاز آج ہی کی صبح سے تو یاں کی عیدوں کا
 کہ جب سورج کی ان سب شرکوں میں نئی ہو چلا
 ہمارے پر جفا الگ اسی دن اپنی رسموں کو
 بجالا کر کھینچے سخت بے شرمی کے کاموں کو
 اسی کا غم کریں ہم؟ تا تو ان نیکی تو نہاں ہو؟
 اور اُسکے بدلے دل پر طراںِ نوحہ سے عصیان ہو؟

نہیں۔ ہم تو زیادہ خوش ہوں اپنی ایسی حالت پر
 کہ تلخی رنج کی غالب نہ آئے پائے ہمت پر

وہی (نغمہ)

جن جن مسرتوں کا بدی پر مدار ہے
 انجام اُن کا یہ ہے کہ دل بیقرار ہے
 محنت سے نیک پاتے ہیں نیکی یہ جان لو
 اور اپنے دکھ کو چشمہ لُذاتِ مان لو۔

مندان کو بولو دے گا نہ اپنی وہ بُو کبھی
 جیتنا کہ جڑ ہے اسکی زمیں میں لگی ہوئی
 لیکن اُسے جو کاٹ کے کچلو تو دیکھتا

وہی (شعر خوانی) اک آن میں نہک اٹھے گی گرد کی فضا
مگر خاموش میرے بچے! ظالم حاکم آتے ہیں

نفساں کو بختی ہیں انکی تائین شادمانی کی
خبر دیتی ہو اے ان کی قربت اور روانی کی
یہ بڑھتا شور کا کتنا ہے آتے ہیں وہ سرعت سے

پوجاری (نغمہ) مرے بچو! بچے رہنا تم ان لوگوں کی سنگت
رکھدانی پوجاری میت سے زن و مرد کے ساتھ آتے ہیں
یا رو آؤ! عید کا وقت آگیا

دوسرا پوجاری (نغمہ) کوئی لذت آج ہم سے رو نہ جائے
"نیش کو نکلو" ہے سورج کہ رہا
شہ بھی آتا ہے کیاں عشرت مناے
شمس ہی کی سی ہے برکت شاہ کی

کلہانی عورت (نغمہ) دونوں رحمت ہیں ہمارے واسطے
شمس سے گرہے فلک پر روشنی
تو زمین کی روشنی ہے شاہ سے
علیدی آؤ مرے کے رسیا

کلہانی مرد (نغمہ) ہون میں پر ہی چھم عشق کا تحفا
چہ لہ لو اور سب کو چھوڑو
ان میں نہ آئے تم کو مزہ گر

پہلا پوجاری (نغمہ) جھک پڑو جھٹ پٹ اور مزوں پر
مے ہے مزے کی تر کو لب کو
مے بھی مزے کی حُسن بھی پیارا

میسوں مزوں کا ان سے سہارا
کس کا شوق نہیں ہے سب کو

دوسرا پوجاری (نغمہ)

پھانٹوں اس کی کسے ہے فرصت؟

سب کا شوق ہے۔ سب سے رغبت
دوہوں کا لطف اٹھاؤں کاشب کو
مگر یہ کیوں؟ کہ سارا ملک ہے جب عیش سے شاہاں

پہلا پوجاری (شعر خوانی)

اسیرانِ یہوداں کر رہے ہیں نالہ و افناں؟
بچاؤ کیوں نہ تم اہلِ یودا بانسری اپنی
گنتے جھاریوں میں کیوں تھامے چنگ بریانی؟
اٹھاؤ بانسری۔ اور چھڑ دو تم اپنا بھی نغمہ
سناؤ راگِ مسیحا کا تقاضا یہی اس دن کا
ٹھٹھا دو غم کو۔ اور تانیں لگاؤ ساتھ ہم سب کے
ضرورت ہے کہ تم سا بالکل اپنی بھی دھن چھڑ

وہی (نغمہ)

جو جو لمحہ آتا ہے

عیشِ نیا اک لاتا ہے

آؤ۔ تم تو دانا ہو

وقت کو مفت نہ جانے دو

کل پھر ہاتھ نہ آئے گا

(نغمہ)

آج کا لطف جو جانے گا

آہ! کہ کل بچھٹاؤ گے

جیسا کرو گے پاؤ گے

(شعر خوانی)

گر تیار ساسل۔ اور ذلیل و پست و خوار ایسے

مشقت میں بھینسے۔ آفت زدہ۔ اور ہوتا رہے

ہی ہے وقتِ بیدار و بھلا گئے بجائے کا؟

شریکِ کار ہاں سے شرک ہو کر لطف اٹھانے کا؟

نہیں۔ ہرگز نہ ہو گا یہ۔ یہ ہاتھ اُس ہی غارت ہو گا

جو استادِ زمان۔ شاقِ فن ہاں سے سرست ہوں!

اگر بھولیں ہم اپنی سرزمین اور اپنے موطن کو!
کریں یا کام جس سے اتفاقاً لطف نازل ہوا
دوسرا پوجاری (شعر خوانی) گستاخ غلامو! تم اگر یوں نہ سنو گے

تو یاد رہے سخت مصیبت میں پھنسو گے
پہلا نبی (شعر خوانی) کیا خوف! کرو ظلم! یہیں بس ہے یہ نینت

اللہ سے ڈرتے ہیں نہیں اور کوئی دہشت
(سب کلدانی چلے جاتے ہیں)

اسرائیلی گروہ (نغمہ) کیا بدلے کی اس دل کو بھلا قید و اذیت
رہتا حرم سینہ میں ہے جو بہ حفاظت؟

لفز عشق نہ ہوا عدا کو دکھا دو یہ تجل
کہتے ہیں جسے فتح وہ ہے ضبط و تحمل
(سب چلے جاتے ہیں)

دوسرا کھیل

(حسب سابق کلدانی اور بنی اسرائیل - اور وہی اگلا منظر)

پہلا نبی (نغمہ) نورایاں! مرے دل کے ملکوتی جہاں

ساکن سینہ پرواغ و انیس حرمان
مرحمت کر، مہین تو اپنی دوائے تسکین

وے وہ یوحنا سے اڑے قلب جسکو افلاک

خاک کی تیرہ کثافت سے ہوں یہ آنکھیں صاف

اور آزار و غم و درد سے ہو جائیں خنجریں

بیس ہو چکا - سزائیں بہت دیر ہو گئی

ہے حکم شہر بار کی قلیل لا بدی

راحت تمھاری شاہ کی فرمانبری میں ہے

دیوتاؤں کو سرا ہو نجات اباسی میں ہے

پہلا پوجاری (شعر خوانی)

لیکن کیا جو شاہ کے فراں سے اخراج
 تو اُس کی ہر بانیاں جاتی رہنکی صاف
 سوچو۔ تم اپنے سر پہ بلا کیسی لاتے ہو؟
 سمجھو۔ کہ کیا غصہ تم اُن کو دلاتے ہو؟
 طوفان اُٹھا ہے آفت کا

وہی (نغمہ)

سارے لہراتے سمندر میں
 اندھروہ چلا ہے قیامت کا
 افریقہ کے دشت و دریں
 لیکن طوفان
 چرخ شکن ہاں
 لاتا ہے گو ہر طرح کی آفت
 شاہ کا غصہ
 قہر کا جلوہ

ہے سب سے بڑی پر شور قیامت
 اے قسمت! کیسے میتناک خطرے بڑھ گئے؟
 جان کس دہشت میں ہو؟ اور کیسے یہ مدد سے ہے؟
 اے نیو! واقعتاً سرار و صدقہ لم یزل
 ہو صاف اک لڑکی کی جرأت میں پاؤں گر غفل
 اے آدم بھر کے لیے منظور کہ لو حکم کو
 آنسوؤں سے کل گنہ کا داغ ہم ڈالیں گے
 ہیں عاجز زندگی سے ہم مگر مرنے سے ڈرتے ہیں
 اور اُمید اپنی وہ شامت زدوں کا جو سہارا ہو
 ٹپھانے والے دل کے تازے جو مدد گدہ رہتے ہیں
 بڑھاتے اُسکو اتنا ہیں کہ دم ماریں نہ بارا ہو۔
 یہ اُمید ایکٹ ہندی شمع ہے جو دل میں جلتی ہے

وہی (نغمہ)

بڑھاتی ہے فقط کمبختوں کی یہ راہ کی رونق
پھر اُس پر یان تو اک ظالم اندھیری رات طاری ہو
جو کچھ بھی روشنی ہو دے تو یہ کبھی نہیں مطلق
دوسرا اوجاری (شعر خوانی) پھر اب کیا دیکھو؟ اُٹھو شریکِ جشنِ عشرت ہو

لگا ہین کہتی ہیں آمادہٴ عیش و مسرت ہو
بس آؤ۔ اور گاؤ ایسا دلکش نغمہٴ شیریں
کہ ہو اس جشن کی نام شبہٴ دیباہ سے تفریں
اسیر و۔ ساز چھیرو۔ اور بجاؤ بانسری اپنی

یہ صحبت۔ یہ مٹری۔ یہ جا۔ ہر اک ہونگ بینِ بلی
لو صبح دم کی کرنیں۔ اس آج مسکراتی
کھلائیے وہ جھاڑیوں کی ہیں ارغونِ بجاتی
چکر نسیم کیا کیا جنگل میں ہے لگاتی

پودھوں میں جا کے نریں میں کھیلتی کھلاتی
ایسی تو صوم کا یان اک جشن ہو رہا ہے
آخر بتاؤ موقع یہ کون روئے کا ہے؟

ہم کو کسی کی پروا اب تو نہیں ذرا ہے
ہم تو وہی کریں گے یہ دن جو چاہتا ہے
مگر ٹھہرو۔ وہ دیکھو ان اسیروں کا جو افسر ہے
دوسرا اوجاری (شعر خوانی) جو کہلاتا ہے پیغمبرِ کھنی نے اُسے لب پر ہے

بس اب تم دیکھ لیتا اسکا جو رتبہٴ گلنے میں
ہر اک دھن کے ادا کرنے میں ہر دل کے رجھا میں
ہے کیا جذبِ تیانہ۔ ذرا دیکھو تو صورت کو

یہ پاؤں سے بڑھانے والا طوقاؤں کی شدت کو
گلے کے سر بھی لو اب مل گئے ہیں ہنگ کے سر سے
شیں گے اس سے اپنے شاہ کے اقبال کے نغے

پہلا نبی (نغمہ)

اُتر - دکھن - پورب - پچھم -
 ہر سمت سے فوجیں آتی ہیں!
 ناپاک دلو - اب کانپو تم!
 سب محش زبانیں گونگی ہیں!
 ہر سمت سے طوفان اٹھائے
 ابل پر آ کے برسنے کو!
 خوار می! تباہی! اور ٹٹا ہے
 رونے - مرنے! سر دھتنے کو!

دوسرا نبی (نغمہ)

پامال کر الہی! اور خاک میں ملا دے!
 سورج کے ڈوبنے سے پہلے ہو یہ خدا یا!
 دی ہے سزا جو اس نے وہ ہی ایسے نرا دے!
 یہ ہو چکا مقرر! اب ہو کے یہ رہے گا!
 بس - غلاموں سے جو ہو دے ایسی گستاخی عیاں
 فیصلہ اُس کا کریں گے آپ ہی شاہ جہاں
 ہا سمجھ شامت زدہ! کیا دیکھا تم سب نے نہیں
 مدد کیا کی عظمتیں ان ہاتھوں کی سیٹ گئیں؟
 اُس اندھیرے قید خانے کی طرف پھیرو نظر
 قید ہے جس میں تھا رادہ شہ خستہ جگر
 دیکھو زنجیریں سجاتا - آنکھوں سے مزدور ہے
 غم میں اپنے بیٹوں کے روتا ہے اور مزدور ہے
 یہ بھی سن رکھو غلامو! ہیں ابھی باقی بہت

دوسرا بچار (شعر خوانی)

بھاری بھاری بیڑیاں اور محبس دوزخ صفت
 اٹھیے شاہ ذی شان اٹھیے
 قائم کیجئے قوم کی شوکت
 ملکوں ملکوں سب کی زباں سے

سارکھدانی (نغمہ)

نکلے حضرت ہی کی رحمت
(سب چلے جاتے ہیں)

تیسرا کھیل

(وہی اشخاص - وہی جگہ - وہی منظر)

پہلا پوجاری (شعر خوانی) ہاں دوستو تقدیر نے بیشک کیا ہے فیصلا
یعنی ہماری سلطنت قائم ہے مار و زجزا
مجھوں نے بیکار ہی دیتا ہے دھکی خوت کی
اس سرکشی کے جوش میں خفی عداوت ہو پھری
اپنے تمام وزور کی شہرت ہی دنیا میں ہے
ہاں عدل اپنا روز بدخواہوں کا سر کھلا کرے

وہی (نغمہ)

ہم عمر بے انسان کی
اپنی بڑی شاہنشی

اس کو رہے دائم بقا
گو ساری دنیا ہو فنا

جب کچھ نہ دنیا میں ہے
اُسوقت یہ بابل ٹٹے

دوسرا سرکاری (شعر خوانی) یوں ہی مغرور کے دل میں خیال خام رہتا ہے
گھڑی بھر بعد دیکھو تو نہ عظمت ہو نہ دھواں ہے

مگر ہیں! کیا ہے وہ ٹھگیں جلوس و فخر آش اُس جا
جو اُس میدان کے رخ چپکے چپکے ہے چلا جاتا؟
اور اب دیکھو۔ لیے جاتے ہیں وہ دریا کنٹے پر

جنازہ ایک جھکو میں اٹھاتے تو لوگ کاڑھے پر
مگر افسوس! میری آنکھوں نے کیا خوب پہچانا
یہ وہا کی یہ شاہی نسل کا ہے آخری جلو

ہوئے نصرت ہمارے شاہب خط بھی نصرت میں
جناب مدد کیا جاتے ہوئے آغوش تربت ہیں

بد نصیبو! جنہیں قسمت سے ہے اپنی نفرت (نغمہ) وہی

ابنی محتاجی و اندوہ پر جو رونے ہو۔
پوچھو تو۔ کیسی المٹاک تھی اُس کی قسمت

اور کرو شکر کہ تم اُس سے بہت اچھے ہو
مفرور و باناز ہے جنہیں پیش و شباب پر

پہلائی (نغمہ) وہی

یہ رنگ رلیاں چھوڑ کے اسکو بھی سوچ لو
تم ساتھ تازا سے بھی سجا اور جناب پر

اس کا ہی ساتھ را بھی انجام کار ہو
تم اس شامت زدہ کی غم میں لپٹی لاش تو دیکھو

(شعر خوانی) وہی

یہ سیلا جسم زنجیروں سے ہر جا خستہ تو دیکھو
یہ حلقے دیکھو جو آنکھوں سے خالی ہیں بھلا کس ہیں

بدن پر صیغہ پڑے اور بال دیکھو جو کمر تک ہیں
مگر کیا آسماں بدلے نہ لے گا اسکا دشمن سے؟

مگر اے گانے اُسکو وہ خدنگ ظالم فلک سے؟
مگر کب تک خد لے دو جہاں یہ جوڑا لے گا؟

بخوبی دھکیاں ہوئیں گی تب وہ تھڑالے گا
ہانپتی بھاگتی ہے جیسی کہ زخمی ہرنی

اسرائیلیہ عورت (نغمہ)

کو دیتی پھاندنی شیریں ورداں انہروں کو
اور دریا کوئی طے کر کے نشیبی وادی

کرتا حائل رو صیاد میں ہے لہروں کو
ویسے ہی ہم بھی مصیبت زدہ ہو کر مولا

شوق میں چشمہ رحمت کے ہیں بے صبر و قرار
کون چشمہ؟ جو ہو مظلوم کے حق میں مڑوا

اور زبردست شکر کو کرے زار و نزار
پہلا نبی (شعر خوانی) مگر یہ شور کیسا ہے ؟ معاذ اللہ ! ہیں سب حیراں !

وہ دیکھو برج کرنے کو ہے۔ کیسا چ گیا طوفاں ؟
وہ دیکھو۔ کس کا لشکر سارے میدانوں میں بچھایا ؟

یہ آپو چٹا ہے سائرس کوٹتا اور راتا ہر جا
وہ دیکھو۔ ہو رہی ہے مورچوں کی کیسی پامانی ؟

خداوند اتری ہی تخت ہے باقی ہیں سب فانی !
اسیروں کا گروہ (نغمہ) پامال کر الٹی ! اور خاک میں ملا دے !

بادشاہ کا ہوا غاڑ اس کا ہے وقت آیا
دی جو سزا انھوں نے وہ ہی ابھیں سزا دے !

یہ ہو چکا مقرر۔ اب ہو کے یہ رہے گا !
پہلا پوجاری (شعر خوانی) ہوئی بالکل شکست۔ اور لشکر بابل وہ سپاہ ہے

وہ سائرس فتح عالم برابر بڑھتا آتا ہے
دھواں قصروں پہ اٹھتا اور ہے سیلاب عجب دہری

ہے کیا سخت کاسر بچا ؟ شجاع علی جو کیا خداری ؟
خدا یا رحم اسن اپنی دعا گو دیر میں مانگی

بہیں بچھپانے کو مہلت ملے بس ایک ساعت کی !
دو دنوں پوجاری (نغمہ) مبارک ہیں وہ جو مبارک گھڑی میں

خدا سے جہاں کی طرف کو لگائیں
چھپیں جاکے اُسکے جلال قوی میں

نہ پہلے تباہی کے وہ مار کھائیں

دوسرا نبی (شعر خوانی) زمانہ اب ہمارا ہے ! جری بیاک بد حالو !
خدا سے ڈرنے اور انسان کے آگے بھاگنے والا

جسے بھولے تھے پہلے اُس سے بیکار انتجا ہوا
تھاری جانیں۔ دولت سلطنت۔ غارت ہیں سب کی

وہی (نغمہ)

اولو سفر! ابن صباح پُر خطر
جنت کے اور انسان کے ساتھی قدیم

انسان و جنت اور رب

ہیں تیرے نیکت خواہ رب

اور جاتے ہیں تجھ کو ملعون ورجم

او شہر بابل! کیسا تو غارت ہوا!

پہلا نبی (نغمہ)

اُس اوج سے ہے یہ تباہی سخت تر

سنان یہ سُر کیں تری

ہوں گی ہوا میں سے بھری

یاں پولیں غول و پھیں گدھ و ارباب

یہی انجام ہوا! لیکن سنو۔ وال دور سے کیونکر

خبر دیتی ہے تڑپی اب رگیں پکارے لشکر؟

ہمارا حامی اعظم شہ سائرس ہے آہو بچا

ظفر پیکر عا کر کے ہے آنے کا یہی رستا

بس اب تم چھڑ دو دھن اپنے صیہون نظم کی

مبارک باد گاہ و حامی اولاد آدم کی

بحکم رب اسیروں کے چھڑائے کو وہ آتا ہے

شکر کے لیے بھاری سلاسل ساتھ لاتا ہے

نوجوان اسرائیلیوں کا گرو (نغمہ) اٹھو۔ اور کہو اپنی بے خانمانی

کہ یادِ الم میں ہے اب ملتی لذت

یہ سائرس ہے اک رحمت آسمانی

نصیب اس سے عالم کو ہو خواب رحمت

عہ لو سفر دین تارے (ذہرہ) کو بھی کہتے ہیں اور شیطان کو بھی۔ بائبل چونکہ اس تارے

پوچھتے تھے اسی وجہ سے بنی اسرائیل نے اسکو شیطان کہہ دیا۔ چونکہ یہ تارہ صبح کو طلوع کرتا ہے

اس لیے اسکو ابن صباح کہا پھر شیطان کے واقعات اسکی طرف منسوب کر دیے۔

اسرائیلیہ کیوں گرو (نغمہ) سائرس ہم کو بچانے والا
 الفت و عشرت ساتھ ہیں اُسکے
 آتا ہے رحمت لانے والا
 آتا ہے ہم کو دکھ سے چھڑانے
 آدھے اسرائیلیوں کا گرو (نغمہ) مبارک ہے جو رحم سے حکمراں ہو
 رہے صلح اور امن سے اُسکو الفت
 مبارک ہے جو کھول دے دستِ پاکو
 مگر دل کو کر لے اسیرِ محبت
 سائے اسرائیلی (نغمہ) اپنے حامی اپنے مونس او خداوندِ کریم!
 حمد سب گاتے ہیں دل سے سرمدیت کی تری
 تو کہ ہے بے ابتدا بے انتہا ذاتِ قدیم
 ہو تجھی میں ابتدا اور انتہا ہم لوگوں کی
 (سب جاتے ہیں)

بنی اسرائیل کی مختصر تاریخ

حضرت ابراہیم سے جب وطن چھوڑا تو چند روز سرگردانی کے بعد آپ ابن
 کنعان میں مقیم ہو گئے۔ آپ کے پوتے حضرت یعقوب اپنے گم شدہ فرزند حضرت
 یوسفؑ کی وجہ سے پورے خاندان کے ساتھ مصر میں جاکے فروکش ہوئے۔ وہاں
 اُن کے بارہ بیٹوں سے اُن کی نسل بڑھنا شروع ہوئی۔ جو بارہوں بیٹوں کی
 نسبت سے بارہ سبطوں یعنی قبیلوں میں منقسم تھی۔ اور چونکہ حضرت یعقوب کا
 لقب اسرائیل تھا۔ اس لیے سب "بنی اسرائیل" کہلاتے تھے۔ چند روز بعد اُنکی
 نسلوں کو جمید بڑھتے دیکھ کر مصر والوں نے بنی سبطیوں اور اُنکے فرماؤ اور غور و
 نے اُن پر طرح طرح کے ظلم شروع کیے۔ اس ظلم کے دور کرنے کے لیے اُنھیں
 میں سے خدا نے حضرت موسیٰؑ کو مبعوث کیا۔ اور وہ سارے بنی اسرائیل کو فرعون

کے پنجے سے چٹا کر اپنے قدیم آبائی وطن ارض کنعان کی طرف لے چلے۔ مصر سے اس نکلنے کو خروج کہتے ہیں۔ جو باخلاف روایات ولادت حضرت محمد مصطفیٰ صلعم سے ۲۰۶۱ یا ۲۱۷۱ سال پیشتر ہوا۔ بنی اسرائیل کتنی مدت تک مصر میں رہے؟ یہ بھی مختلف فیہ ہے۔ بعض روایتوں سے ۲۳۰ سال اور بعض روایتوں سے ۲۱۵ سال معلوم ہوتے ہیں۔ لہذا یہ سمجھنا چاہیے کہ حضرت یعقوب ص ح اہل و عیال کے مصر میں ولادت سرور عالم علیہ السلام سے ۲۲۷۶ یا ۲۳۸۶ یا ۲۴۹۱ یا ۲۶۰۱ سال پیشتر تشریف لے گئے تھے۔

حضرت موسیٰ بنی اسرائیل کو مصر سے لے کے نکلے تو مگر زندگی میں ارض کنعان یعنی خدا کی وعدہ کی ہوئی سرزمین میں پہنچنا نہ نصیب ہوا۔ چالیس سال کی دشت فروری کے بعد ان کی قوم ارض کنعان میں پہنچی اور چند روز میں اسیر قابض و متصرف ہو گئی۔ اب اُن میں ایک طرح کی جمہوریت تھی۔ یہاں تک کہ اُن کی تنہا کے مطابق اُن میں سلطنت قائم ہوئی۔ پہلا بادشاہ ساؤل (طاہوت) ہوا۔ اسکے بعد حضرت داؤد یا دشاہ ہوئے جو اُس کے داماد تھے۔ اور پھر حضرت سلیمان تخت نشین ہوئے۔ جنہوں نے ولادت محمد صی سے ۱۶۸۸ سال پیشتر مسیح اقصیٰ یعنی حرم النبی کو تعمیر فرمایا۔

حضرت سلیمان کے بعد ارض فلسطین میں جس کا مستقر بیت المقدس تھا اُن کے بیٹے رحبعام تخت نشین ہوئے۔ اور نقطہ وکسب اُن کے زیر فرمان رہے۔ وشل سبطوں نے اُن کے شمال میں ایک جداگانہ سلطنت قائم کر لی۔ جس کا مستقر شہر سامرہ تھا۔ اس سامرہ کی اسرائیلی سلطنت کا خاتمہ تاہ جازنیا اشکنا نصر کے ہاتھوں ولادت محمد صی سے ۱۲۹۱ سال پیشتر ہوا۔ اور وجہ یہ ہوئی کہ سامرہ کے پچھلے اسرائیلی بادشاہ ہوشع نے نبیوں کی باجگزاری قبول کرنے کے بعد فرعون مصر سو سے سازش کرنی چاہی تھی۔ جس کی سزا میں اشکنا نصر نے ہوشع کو قتل کیا۔ اور دسویں سبط کو حزن و فرزند بکڑے گیا۔ اور آج تک تپہ نہیں کہ یہ دسویں سبط کیا ہوئے اور کن قوموں میں گھپ گئے۔ دوسری سلطنت بیت المقدس کا خاتمہ بابل کے فرمان روا بخت نصر کے ہاتھ سے ۱۱۶۹

سال قبل ولادت سرور عالم ہووا۔ بخت نصرت نے اُن کے بادشاہ صدقیا کے بیٹوں کو قتل کیا۔ اُس کی آنکھیں پھوڑیں۔ اور اُسے اور اُس کی قوم یعنی باقی ماندہ دوسسٹون کو مع عورتوں اور بچوں کے بابل میں بکڑلایا۔ اور اُن سے غلامی کی محنت لی جاتے لگی۔ یہاں تک کہ سنہ قبل محمد میں سائرس نے آکر بابل کو تباہ کیا۔ اور بنی اسرائیل بیت المقدس میں واپس آئے۔ جس وقت کی تصویر اس ڈراما "اسیری بابل" میں دکھائی گئی ہے۔

نیچرل شاعری

ان دنوں عموماً انگریزی وادون کو انگریزی مذاق کے استخراج کی بدولت اردو شاعری میں ایک خاص قسم کے تغیر کی ضرورت محسوس ہونے لگی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ جس زبان کو انسان باضابطہ اصول و قواعد کے ساتھ پڑھتا ہے۔ جس کی صرف و سخن اور جس کی فصاحت و بلاغت اور شان و آفتاب و آرائی کے نکات کو حاصل کرتا ہے اُسی زبان کا مذاق اُس کی طبیعت پر غالب آجاتا ہے۔ اور اُسے اُس زبان میں جس قدر لطف آئے لگتا ہے خود اپنی زبان میں نہیں آتا۔ اگرچہ اپنی زبان کو دیکھتا زیادہ ہے مگر اُس کے محاسن اور اُس کی خوبیوں پر اُس کی نظر نہیں پڑ سکتی۔ اگر اردو زبان کو بھی ہمارے نوجوان اُس طرز سے پڑھتے جس طرح کہ انگریزی یا دیگر زبانوں کو پڑھتے ہیں تو شاید متماثر طور پر اُنھیں معلوم ہو سکتا کہ خود اردو کے خزانہ ادب میں کیا کیا خوبیاں اور کیسے کیسے لطف ہیں۔ مگر یہ فیسیبی سے اردو زبان میں قریب قریب ہر علم و فن کی کتابیں تصنیف ہو گئیں اور انہیں تصنیف ہوئیں تو اُس کے نحو و صرف کی یا اُس کے معانی و بیان اور علم فصاحت و بلاغت کی۔ اور جب اس قسم کی کتابیں ہی نہیں ہیں تو یہ علوم پڑھائے کیونکر جائیں۔ بعض حضرات نے خود صرف کے دو ایک رسالے تصنیف فرادیے ہیں مگر اُن کو اس سے زیادہ وقت نہیں کہ عربی یا انگریزی کے نحو و صرف سے ترجمہ کر لے گئے ہیں۔ ایسی کتاب ایک بھی نہیں ہے جو اردو زبان پر غور کر کے اُس کی ترکیبوں اور بندشوں اور ترتیب الفاظ کو پیش نظر رکھ کر لکھی گئی ہو۔ لہذا اس نقصان کا یہ لازمی نتیجہ ہے کہ ہمارے نوجوانوں کو جتنا ادبی ذوق غیر زبانوں میں پیدا ہوتا ہے خود اپنی زبان میں نہیں پیدا ہوتا۔

اردو نے دو مختلف اور متضاد زمانوں میں دو قسم کے رنگ دیکھے۔ اوّل اُسکی دو حالتیں رہیں۔ پہلے زمانے میں طلبہ عموماً فارسی زبانوں کی باضابطہ تعلیم پاتے تھے اور اُس کا نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ خود اپنی زبان کی خوبیوں کی طرف

توجہ کرنے کی عوض وہ عموماً اردو میں اُن محاسن اور لطفون کے پیدا کرنے کی کوشش کرنے کی کوشش کرتے تھے جنہیں اُنھوں نے فارسی عربی میں نہایت دلچسپی کے ساتھ دیکھا تھا۔ اپنی زبان کو وہ روز بروز انہیں نقش و نگار اور گل بوٹوں سے سجے جاتے تھے جن کو اُنھوں نے فارسی و عربی کے باغوں سے لیا تھا۔ وہی تشبیہات وہی استعارات۔ وہی رمز و کمانے۔ اور وہی عالی خیالات جو اُن زبانوں میں تھے اس میں بھی پیدا کیے گئے۔ اور اسی قسم کا کتاب الفاضل اردو کا بھی زیور سمجھا جانے لگا جیسا کہ فارسی و عربی کا زیور تھا۔

اب اسکے بعد دوسرا زمانہ شروع ہوا جبکہ انگریزی کی تعلیم پڑھنا شروع ہوئی اور ہندوستانی طلباء کے دل و دماغ پر انگریزی مذاق حاوی ہونے لگا۔ اس دور میں اگرچہ اردو کا کتب خانہ بہت وسیع اور مال مال ہو گیا۔ اور سر علم دن کی کتابیں اس زبان میں تصنیف ہوئیں۔ مگر اردو کی تعلیم میں وہی نقص بدستور باقی رہا کہ اسکی نحو و صرف اور اس کی فصاحت و بلاغت کی طرف کوئی خاص توجہ نہیں کی جاتی۔ اب سجاے عربی و فارسی کے طلبہ انگریزی کو پڑھنے لگے اور اپنے قومی مذاق کے عوض اُن کے دل و دماغ پر یورپ کا مغربی مذاق حاوی ہونے لگا اُنھوں نے انگریزی کی لمائی خوبون اور مغربی انشاپردازی کے رنگ کو دیکھا اور جس طرح دور اولین والے اردو میں عربی و فارسی کی لطافت کو ڈھونڈنے لگے یہ انگریزی کی خوبون اور دلچسپیوں کو ڈھونڈنے لگے۔ مگر خود اپنی زبان کی ذاتی خوبون سے جس طرح پہلے دور والے ناواقف تھے یہ بھی ناواقف ہیں۔

ان دونوں زمانوں کی حالت دیکھنے اور سمجھنے کے بعد یہ صاف طور پر معلوم ہو جاتا ہے کہ جس تنیر کی ضرورت فی الحال محسوس ہوتے لگی ہے وہ صرف اس قدر ہے کہ یہ گروہ جو فارسی و عربی کے مذاق اور اسکی انشاپردازی کے ذوق سے ناواقف ہے۔ چاہتا ہے کہ اردو انشاپردازی میں وہ لطف اور دلچسپان پیدا ہوں جو انگریزی میں نہیں نظر آتی ہیں۔ جس کو اگر ہم زیادہ واضح اور نمایان طور پر بتانا چاہیں تو یوں کہہ سکتے ہیں کہ یہ نئی جماعت جس قسم کا تغیر و تبدل اپنے اخلاق و عادات اپنی وضع و لباس اپنی معاشرت و محبت میں کرتی جاتی ہے اسی قسم کا تغیر

زبان میں بھی چاہتی ہے۔

ان نئے ترمیم و تغیر چاہنے والوں سے اگر یہ سوال کیا جائے کہ تم زبان میں کس قسم کا تغیر و تبدل چاہتے ہو تو اور کوئی ایسا جواب جس سے اُن کا نالی بے اختیار اور ان کا مفہوم ہمارے ذہن نشین ہو جائے ہرگز نہ دے سکیں گے۔ اور وجہ یہ جو کہ صاف صاف الفاظ میں یہ تو کہہ نہ سکیں گے کہ ہم اردو کو انگریزی بنا دینا چاہتے ہیں۔ لیکن ہاں یہ کوشش کریں گے کہ اپنی اسی خواہش کو ایسے الفاظ میں ادا کریں جن سے ظاہر ہو کہ کسی کی تقلید نہیں چاہتے بلکہ اپنی زبان میں ایک مہذب اور موجد انقلاب پیدا کرنا چاہتے ہیں۔ چنانچہ اسی غرض کے لیے "نیچرل شاعری" کا لفظ اختیار کیا گیا ہے۔ اور کہا جاتا ہے کہ ہم اردو میں ایسی شاعری چاہتے ہیں جو نیچرل ہو۔

مگر "نیچرل شاعری" کیا چیز ہے؟ اس سوال کا جواب دینا ہمارے نو عمر انگریزی وادوں کو مشکل ہوگا۔ کیونکہ جو حقیقی تغیر اُن کے ملحوظ خاطر ہے وہ صرف اتنا ہی نہیں کہ اردو و شاعری میں فطرتی جذبات پیدا ہوں، بلکہ وہ اس کے علاوہ کچھ اور بھی چاہتے ہیں۔ اردو میں نیچرل جذبات کب نہ تھے۔ تیرے لے کے دماغ کے زمانے تک کوئی شاعر نہیں گذرا جسکے کلام میں ایسے اشعار نہ پائے جاتے ہوں۔ جن میں نیچر کے جذبات اچھی طرح موجود نہ ہوں۔ صرف اسی قدر نہیں اردو شاعری کی عمر کے محدود میں ایسے شاعر موجود رہے جو صرف فطرتی جذبات اور نیچرل مذاق ہی کے دلدادہ تھے۔ خصوصاً ہمارے فخر ہندوستان شاعر دماغ دہلوسی نے تو نیچر کو سامنے کے اور پیش پا افتادہ معاملات کے ذریعہ سے اس خوبصورتی کے ساتھ دکھایا ہے جس سے زیادہ ترقی کرنا بہت دشوار ہے۔ پھر جب یہ رنگ شروع ہی سے اردو میں موجود ہے تو ہم نہیں سمجھ سکتے کہ اور کون سا نیچرل تغیر چاہا جاتا ہے؟

اس سب کے حل نہ ہوتے یہی انگریزی دان طلبہ کی خیالی نیچرل شاعری کا مطلب سمجھ میں نہ آئے کی یہ برکت ہے کہ مختلف لوگوں میں نیچرل شاعری کے مختلف منی سمجھے جاتے ہیں۔ بعض حضرات قومی شاعری اور خواجہ لطافت حسین صا

جانی کے رنگ ہی کو نیچرل شاعری خیال فرماتے ہیں بعض حضرات نے اخلاقی
 نظموں کا نام نیچرل شاعری رکھ لیا ہے۔ وہ نصیحتناہ اشارہ کرتے ہیں اور انکو
 نیچرل شاعری کے لقب سے پٹاک کے سامنے پیش کرتے ہیں۔ بعض لوگ
 جو انگریزی میں زیادہ استعداد رکھتے ہیں ان کے خیال میں نیچرل شاعری اسکا
 نام ہے کہ جو عنوان انگریزی شاعری کا ہے جو استعارات و تشبیہات انگریزی
 میں استعمال کیے جاتے ہیں انکو اردو میں استعمال کرنا۔ اور اردو اشعار میں
 یہ شان پیدا کر دینا کہ وہ انگریزی اشعار کا ترجمہ معلوم ہوں نیچرل شاعری ہے۔
 لیکن ایسی شاعری کو عام اس سے کہ وہ بُری ہو یا اچلی سبائے "نیچرل شاعری"
 کے "انگریزی شاعری" کہنا شاید زیادہ موزوں و مناسب ہوگا۔

نیچرل شاعری جہاں تک ہم خیال کرتے ہیں اردو میں بہت کچھ موجود ہے۔
 اگر اساتذہ سخن کے دیوانوں میں سے ایسے اشعار جن لیے جائیں جن میں کوئی
 خیال بہت سادگی کے ساتھ بندھ گیا ہے۔ یا جن میں سوز و گداز و جوش و دل یا
 حسن و لغز کی سچی تصویریں نظر آئیں تو ہم سمجھتے ہیں نیچرل رنگ کے
 کلام کا ایک اچھا ذخیرہ جمع ہو جائے گا اور ان اشعار سے ہزار درجہ اچھا ہوگا
 جنہیں آج کے نئے خیال والے "نیچرل شاعری" کا نام لے کے ملک کے سامنے
 پیش کر رہے ہیں۔ مگر نیچرل رنگ کو ترقی دینے کے لیے ضرور ہے کہ عام شاعری
 میں غزلیت کی قید اٹھا دی جائے۔ غزل اصل میں خیال آفرینی اور
 قادر الکلامی کی مشق کے لیے ہے۔ اس لیے نہیں کہ شاعری کا اصلی مقصد قرار
 دے دی جائے۔ اثر کلام میں اُسی وقت پیدا ہو سکتا ہے جب موجودہ قیود کو
 دور کر کے چھوٹے چھوٹے نو تر اور جوش پیدا کرنے والے واقعات قطعات ثبوتی
 یا سدس و ثبوت کی حیثیت سے نظم کیے جائیں۔ اور شاعروں یا گلدستوں میں بجا
 اسکے کہ قافیہ پیمانی اور تنگ بندگی کے لیے الفاظ دیے جائیں۔ عمدہ خیالات
 اور پُر اثر واقعات دیے جائیں۔ جتنی توجہ ہمارے نوجوانوں کو غزل کوئی
 کی طرف ہے اتنی ہی توجہ اگر اس قسم کے سبکپٹوں کی طرف ہو جائے تو چند ہی
 روز میں نظر آجائے گا کہ شاعری کیا ہے کیا ہو گئی اور کہاں سے کہاں

جا پہنچی۔ ایسی نظیں کہنا غزل گوئی سے کچھ زیادہ مشکل بھی نہیں ہے۔ گریات کیا جو کہ لوگوں کو غزلین کہنے کی عادت پڑی ہوئی ہے اور کسی واقعہ کی موزون کرنے کے عادی نہیں ہیں۔ صرف عادت نہ ہونے کی وجہ سے کسی قدر دشواری معلوم ہوتی ہے جو تھوڑی سی توجہ سے دور ہو سکتی ہے۔ لیکن توجہ نہ کرنے کا کوئی علاج نہیں۔

مگر اس قسم کی نظیں کہنا یا شاعری کے رنگ اور مذاق میں کسی قسم کا تغیر تقریباً اگر تا سب کچھ کی باتیں ہیں۔ پہلی ضرورت اس بات کی ہے کہ ملکی طلبہ کو اردو زبان اصول و ضوابط کے ساتھ اولیاً وقت پیدا کرنے والے طریقے سے پڑھائی جائے۔ اب ہر علم و فن کی کتابیں بھی اردو میں پیدا ہو گئی ہیں۔ اور ہر قسم کی ضرورت ایک حد تک اردو ہی کے ذریعے سے پوری ہو سکتی ہے۔ اگر کچھ نقصان ہے تو وہی نحو و صرف معانی و بیان اور ادبی کتابوں کا۔ جو لائق مصنفوں کی تھوڑی سی توجہ سے دور ہو سکتا ہے۔ لیکن اس بات کو بوجہ یہی طرح ذہن نشین کر لینا چاہیے کہ جب تک اردو زبان باضابطہ طور پر ملکی طلبہ کو نہ پڑھائی جائے گی اس وقت تک اُن میں وطنی زبان کی قدر کرنے کی لیاقت نہیں پیدا ہوگی اور دوسری زبان کے لٹریچر کے مقابلہ میں وہ ہمیشہ اپنے لٹریچر کو بیچ اور پوچ سمجھیں گے۔ اگر غور سے دیکھیے تو اردو زبان میں کوئی خوبی نہیں جو موجود نہ ہو۔ اُس میں بہت ہی اچھے اور خوبصورت محاورات ہیں۔ اُس میں ہر قسم کی نزاکتیں اور مستتین ہیں۔ الفرض جتنی لٹریچری خوبیاں کسی زبان میں ہو سکتی ہیں ہماری زبان میں بھی موجود ہیں۔ ضرورت ہے تو اس بات کی کہ نو جوانوں میں تعلیم کے ذریعے سے اُن خوبوں کے سمجھنے اور اُن سے لطف اٹھانے کا مادہ پیدا کیا جائے۔

ازماست کہ ریاست

من و سلوئی کا نام زبان پر آتے ہی خوش اعتقاد اور نیک ارادہ تر سون

کے منہ میں پانی بھرتا ہو گا۔ اور واقعی جب وہ خدا کی نعمتیں قہین تو فرما دیا بھی ضرور ہون گی۔ مگر بنی اسرائیل چند ہی روز میں اس نعمت الہی سے اُکتا گئے۔ اور کہا، ہمیں تو کھانے کے لیے زمین کی پیداوار ملنی چاہیے۔ "خیر خدا نے اُن کی یہ احمقانہ آرزو پوری کر دی۔ مگر جب وہ کھیتوں پر ہل چلائے۔ بیلوں کی دُم مڑوڑنے۔ اور جتنے پونے کو کھڑے ہوئے ہون گے اور سر کا پسینہ ایڑی کو پہنچا ہو گا۔ اس وقت ممکن نہیں کہ نہایت ہی حسرت و اندوہ کے ساتھ نہ کہہ رہے ہوں کہ یہ سب اپنا ہی کیا دھرا ہے۔ اور "ازراست کہ براست۔"

اسی ایک واقعے پر منحصر نہیں۔ بنی اسرائیل کو اُن کے عروج کے زمانہ میں زیادہ تر اسی بات کا یقین دلایا گیا تھا کہ جتنی بلائیں اور آفتیں آتی ہیں اور جتنی مصیبتوں سے سابقہ پڑتا ہے سب اپنے ہی دنیاوی اعمال کا نتیجہ ہیں وہ "ریڑی بوشن" کے قائل تھے۔ یعنی اعتقاد رکھتے تھے کہ ہر بے بھلے کام کا بدلہ دنیا ہی میں مل جاتا ہے اور اگر خدا کا گناہ کی سزا دینے میں دیر لگائے تو تو بہ کرنے کے لیے خود ہمیں کو اپنی زندگی ختم کر دینی چاہیے۔ یہ اصول اگرچہ بعض حالتوں میں بظاہر اسباب پورا نہیں اُترتا۔ مگر اس میں بھی شک نہیں کہ اکثر انسان اپنی ہی بد اعمالیوں کے بھگتنے پر مجبور ہوتا ہے۔ آخری مذاہب نے اگرچہ جزا و سزا کو اُس دوسری زندگی سے وابستہ بتایا تو کوئی مضائقہ نہیں۔ بیشک انسان مرنے کے بعد اپنے اعمال کا بدلہ پائے گا۔ مگر کچھ ضرور نہیں کہ اپنے حرکات و سکنات کا پھل اس دنیا میں بھی نہ پائے۔

اصل یہ ہے کہ جن امور کو محض خدا شناسی اور رموز و حید سے تعلق ہے یا یون کہیے کہ جن باتوں کا معاملہ صرف خدا کے ساتھ ہے اُن میں ہم ثواب یا سزا اُسی عالم میں پائیں گے جس عالم سے کہ اُن امور کو تعلق ہے۔ مگر ظلمتی جرائم جن سے ہم دنیا و الون کو متاثر ہو سکتے یا دنیا میں فتنہ و فساد پیدا کرتے ہیں اُن کی پاداش ضرور ہے کہ ہمیں دنیا ہی میں مل جائے۔ ہم کسی پر ظلم کریں تو یقین کر لینا چاہیے کہ کوئی ہم پر بھی ظلم کرے گا۔ ہم کسی کو ستائیں تو دل میں سوچ رکھیں کہ ہمیں بھی کوئی ستائے گا۔ ہم کسی کی توہین کریں تو

خوب جان لین کہ کوئی بہین بھی ذلیل کرے گا۔ اور ہم کسی کو نقصان پہنچائیں تو اس میں ذرا بھی شک نہ کریں کہ کبھی کسی کے ہاتھ سے بہین بھی نقصان پہنچے گا۔

اخلاقی اور دنیاوی جرائم کا جو باہمی رد و بدل ہوتا رہتا ہے اسکی زیادہ نمایاں اور واضح تصویر ہمیں اُن شخصی سلطنتوں میں نظر آسکتی ہے جن میں بادشاہ کی زبان ہی قانون ہوتی ہے۔ اور جہاں فرمانروا کی ادنیٰ برہمی استبداد کی جانتی یا جان بخشی کا کافی بہانہ ہوتی ہے۔ جو برتاؤ فرمانروا اپنے دیار والوں کے ساتھ کرتا ہے جس نظر سے اُنہیں دیکھتا ہے۔ جس ادب و تعظیم کا ان سے خواستگار ہوتا ہے اُنہیں تمام باتوں کو اُس کے درباری جو تمام رعایا کے مقابلے میں معزز و محترم خیال کیے جاتے ہیں اپنے ماتحتوں اور ملازموں سے چاہتے ہیں اور یہی سلسلہ درجہ بدرجہ انسان کے ہر درجے سے لے کے ادنیٰ سے ادنیٰ طبقے تک پہنچتا ہے۔ یہاں تک کہ ہر شخص اپنے بچوں۔ اپنی بی بی اور اپنے دست نگر عزیزوں سے اُسی ادب و تعظیم کا خواستگار ہوتا ہے جو بہین تحت شاہی اور وہیم خسروی کے آگے نظر آتی تھی۔ یہ رنگ دیکھتے کے بعد اب تم نیچے کے طبقے سے ہر درجے کے معزز لوگوں کو دیکھتے ہوے چلو تو تم کو عجب سیر نظر آئے گی اور دیکھو گے کہ ہر شخص ماتحتوں کو ذلیل کرنے کے بعد جب بالادست لوگوں کے سامنے جا کے ذلیل ہوگا تو تم اُس سے زبان حال سے ہی کہتے سونگے کہ ازماست کی راست۔ کیونکہ وہ جو کچھ کہ چکا ہے اُسی کا تھیازہ بھگت رہا ہے۔ صرف آخری اور سب سے بلند درجے میں پہنچ کے ہمیں ایک ذات بادشاہ کی البتہ ایسی نظر آئے گی جو بظاہر سب کو ذلیل کرتا ہے اور اُسے کوئی ذلیل نہیں کرتا۔ مگر اُسکی حالت کو اگر غور سے دیکھو تو اصل میں وہ سب زیادہ ذلت اُٹھا رہا ہے۔ اول تو خدا کی طرف سے بیماریاں پریشانیان آفتیں اور مصیبتیں غرض جتنی بلائیں آتی ہیں سب اُسکے حق میں انتقام کی صورت بن کے آتی ہیں۔ مگر ہمیں۔ اُنکے علاوہ سب سے زیادہ اُسے ذلیل کرنے والا اور ہر وقت ملامت کرنے والا اُس کا کاشنس ہے۔ جو ہر گھڑی

ایک آفت کی طرح اُس پر سطر رہتا ہے۔ اور اُس کی غلطی۔ اُس کے ہر ظلم اور سنگی ہر شہوت پرستی کو ایک نہایت ہی صیب جاسہ پنہا کے اُس کے سامنے پیش کرتا ہے اور اُس کے حق میں ایک دنیاوی عذاب بن جاتا ہے۔ اور ممکن نہیں کہ آزاد دو تکلیفوں سے گھبرا کے کبھی کبھی اُسکی زبان سے یہ کلمہ نہ نکل جاتا ہو کہ "ازماست کہ بر راست"۔ سچ یہ ہے کہ اگر ہم غور و تعمق کی نظر سے دیکھیں تو صاف نظر آجائے گا کہ اُس عالم آخرت کے دوزخ سے پیشتر خدا نے ہمارے لیے دنیا میں بھی ایک سخت اور نہایت ہی اذیت رسان دوزخ بنا رکھا ہے۔ جسکے عذاب سے شاؤ و ناوہی کوئی بچ سکتا ہے۔



شادی و غم

ان الفاظ سے بیان ہماری مراد شادی عاشق حسین صاحب کا نا دل "شادی و غم" نہیں ہے جسے باپو جے نرائن صاحب فی الحال از سر نو چھپوا رہے ہیں۔ بلکہ اصل میں ہمارا مقصد صرف اس قدر ہے کہ ان الفاظ کے اثر پر نظر ڈالیں۔ اور دیکھیں کہ فلسفیانہ طور پر قدرت نے انھیں کس ترتیب سے رکھا ہے۔

دنیا میں کوئی چیز اور کوئی جذبہ انسانی نہیں ہے جس میں اسی قسم کی دو مخالفت و متضاد کیفیتیں نہ ہوں۔ وہی نسبت جو دوزخ و جنت۔ اعلیٰ و ادنیٰ۔ لطیف و کثیف۔ مرنے و مارے مرہ۔ یہ لطف و بے لطف۔ اور اچھے اور بُرے میں ہے وہی ان دونوں لفظوں میں بھی ہے۔ دنیا میں کوئی کیفیت اور کوئی حالت نہ ہوگی جو اسی قسم کی دو متقابل جہتوں اور ضدوں کی تابع نہ ہو۔ اور شاید اسی فلسفہ پر نظر کر کے زرتشتی مذہب کے عقلمندوں نے نور و ظلمت کا اصول قائم کر کے ایسی تمام کیفیتوں کو اُسی کے تابع کر دیا۔ اگرچہ اس میں زیادہ کچھ ہونے سے وہ اس عقلمندانہ غلطی میں مبتلا ہو گئے کہ خدا اور شیطان کی یہی اسی ہی دو متباہن و متضاد

تو تین تسلیم کر لینے سے دو خداؤں کے قائل ہو گئے۔ اور ان لوگوں کی اصطلاح میں جو سچی توحید اور قوتِ یزدانی کے سب سے بالاتر ہونے کے مقتصد و معترف ہیں شوی یعنی دو خداؤں کے ماننے اور مشرک ہونے کے ملزم ٹھہرے۔

اسل حقیقت یہ ہے کہ ہر کیفیت اور ہر چیز میں یہ متضاد صورتیں محض اس لیے پیدا کی گئی ہیں کہ بغیر اس کے ایک دوسرے کا حسن و قبح معلوم ہی نہیں ہو سکتا۔ دن اس لیے دن ہے کہ رات کے بعد آتا ہے۔ اور رات اس لیے رات ہے کہ دن کے بعد آتی ہے۔ پھر ان دونوں کا باہمی مقابلہ ہر شخص کو اپنے خیال و مذاق کے مطابق اس امر کا فیصلہ کرنے پر آمادہ کرتا ہے کہ دونوں میں سے کون اچھا ہے اور کون بُرا۔ اور یہی حالت اور نسبت اسی طرح کی تمام کیفیات میں خیال کریجیے۔

فلسفیوں میں ایک نازک بحث پیدا ہوئی ہے کہ دنیا میں خوشی زیادہ ہے یا غم۔ مگر غور اور انصاف سے دیکھیے تو یہ بحث ہی ایسی ہے جیسے کوئی پوچھے کہ دنیا میں دن زیادہ ہے یا رات زیادہ ہے۔ اگر تحقیق کی نگاہ سے دیکھا جائے تو دونوں کے سرچشمے خدا نے یکساں درجے پر سیر اور بھی نہ خشاک ہونے والے پیدا کیے ہیں۔ مگر ہاں یہ ہماری استعداد اور قابلیت کا نتیجہ ہے کہ ان میں سے کس کے اور کس مقدار میں حاصل کرتے ہیں۔

جو لوگ صوفیہ کے خیالات کے زیادہ متبع ہیں اور خاصہ وہ جو دنیا کی ہر چیز کے چھوڑ دینے کو حقیقت و مذہب تصور کرتے ہیں۔ ان کا اکثر یہ دعویٰ ہوتا آتا ہے کہ انسان کو خوشی بہت کم ملی ہے اور غم زیادہ۔ وہ انسانی افکار و ترددات۔ زندگی کی مشکلات اور دشواریوں۔ اس عالم ہستی کی آکاسیوں اور مایوسیوں کو پیش کر کے کہتے ہیں کہ دنیا دار المحن ہے۔ اور اس میں بقا بلکہ رنج و الم خوشی بہت ہی کم ہے۔ ان لوگوں کا یہ خیال قریب قریب ان لوگوں کا سا ہے جو اپنے تمام افعال و اعمال کو قسمت کے محول کر کے ہاتھ پاؤں چھوڑ کے بیٹھ رہنے کے موید ہیں۔

گردہ گردہ جو دنیا کے "مزرعۃ الآخرة" ہونے کا قائل ہے اسی پست ہمتی اور ایسے سطل محض بن جانے کے خیال کی تائید نہیں کر سکتا۔ واقعی جب خدا نے خوشی اور غم کے خزانوں کو یکساں طور پر مخلوق و مہمور بنا کے ہمیں ان پر متصرف کیا ہے تو پھر یہ کہنا کہ ہمیں غم زیادہ دیا گیا ہے بظاہر ایک ناشکری کا نا خیال ہے۔

سچ یہ ہے کہ ہمیں خوشی یا غم ان دونوں میں سے جو چیز نصیب ہوتی ہے وہ خود اپنے ہی ہاتھوں نصیب ہوتی ہے۔ اپنی زندگی کے حالات پر غور کرو۔ اپنی ضرورتوں کو کتنے چینی کی نظر سے دیکھو۔ اور اس بات کو خیال کرو کہ جن چیزوں کی احتیاج و ضرورت کے ہم دعویٰ ادہن ان میں سے حقیقتہً کتنی ضرورتی ہیں اور کتنی غیر ضروری۔ دنیاوی تکلفات میں پڑنے کے تعلقات کو بڑھانے اور اپنے حوصلوں اور اپنی آرزوؤں کو فضول و سست دے کے ہم نے اپنی یہ حالت بنائی ہے کہ ہوسوں کا دامن کسی وقت ہاتھ سے نہیں چھوٹتا۔ اور زندگی کی کوئی گھڑی ایسی نہیں ہوتی جس وقت ہم کسی ضرورت کو نہ محسوس کر رہے ہوں۔

مسرت کیا چیز ہے؟ نہ روپیہ ہے نہ پیسہ ہے۔ نہ عالیشان قصر و دیوان ہیں۔ نہ خدم و خشم ہیں۔ نہ حکومت و سطوت ہے۔ اس لیے کہ اگر ان چیزوں سے حقیقی مسرت حاصل ہوتی تو ہم کسی بادشاہ و امیر کو کبھی لمبوں و افسردہ نہ پاتے۔ ان کے دل میں اور ان کی اس امیرانہ بلکہ شاہانہ و صوم و صہام میں سچ پوچھیے تو ہمارے غموں سے بڑے غم اور ہماری حیرتوں سے بڑی حیرتیں موجود ہیں۔ جس طرح ایک کو ہستانی سلسلہ و دور سے ٹھیک نہایت سطح پر فضا اور دلچسپ معلوم ہوتا ہے اور نزدیک سے جاکے دیکھ کر تو اتنا سے زیادہ غیر سطح۔ بہت ہی پرخطر اور وحشت ناک نظر آتا ہے اسی طرح اسے غریبی کی زندگی بسر کرنے والو۔ امیروں اور بادشاہوں کی سطوت و حشمت اور ان کے عالیشان قصر و دیوان ٹھیک دور ہی سے عشرت و مسرت کے مامن نظر آتے ہیں مگر ان کے قریب جاکے خود ان کی جگہ پر کھڑے ہو کے اور ان کی

اصلی حالت کا اندازہ کر کے غور کرو تو صاف دیکھ لو گے کہ خوشی اور مسرت اُن کے اس وسیع اور بڑے خزانے میں تم سے بھی کم اور بہت ہی کم ہے۔

اصلی خوشی ایک دلچسپ خیال سے عبارت ہے جو اکثر اُس دل میں زیادہ ہوتا ہے جس میں خواہشیں کم ہیں۔ جس قدر تم اپنی ضرورتوں کا دائرہ تنگ کرتے جاؤ گے اُسی قدر تمھاری مسرت بڑھتی جائے گی۔ ہم نے بڑے بڑے اور نہایت ہی عالی مرتبہ اور صاحب حکومت امیرون کو ادنیٰ طبقے کے مزدوروں اور غریبوں پر حسد کرتے دیکھا ہے۔ یہ معمولی درجے کے لوگ جنھیں تم اپنے فضول اور بڑبڑہ خور سے ادنیٰ و کمتر اور حقیر و ذلیل خیال کرتے ہو ان کی حالت کا جب اندازہ کرو گے تو عام طور پر انھیں اپنے سے زیادہ خوش پاؤ گے۔ سعدی کے کلام میں اُس بادشاہ بن جانے والے فقیر کا یہ جملہ کہ ”اُن دم غم نہ پود و اکنون غم چہلے“ اب ذرا سے لکھنے کے قابل ہے۔ ان غریبوں کو فقط اتنی فکر ہے کہ قوت لایموت کے لیے دن بھر میں کچھ پیسے فراہم کر لیں۔ اُن کے حاصل کرنے کی کوشش میں وہ ہر قسم کی محنت کرنے کو آمادہ ہو جاتے ہیں۔ پھر اس محنت کے بعد جب شام کو اپنی بی بی بچوں میں آ کے بیٹھتے ہیں تو اُن سے زیادہ مسرور اور خوش حال کوئی نہیں ہوتا۔ اُن کی محنت اُن میں رات کے آرام کی قدر پیدا کرتی ہے۔ اور اُس محنت کا حاصل کیا ہوا مختصر سرمایہ اُن کی فکر میں ڈور کر دیتا ہے۔ اور یہ دونوں ایسی برکتیں ہیں جن کی بدولت شام کو انھیں وہ اطمینان و فارغ البالی اور وہ خوشی و خرمی حاصل ہو جاتی ہے جو اُن سے زیادہ استطاعت رکھنے والوں کو کبھی زندگی بھر نصیب نہیں ہوتی۔

ان لوگوں کی حالت دیکھ کے تمھیں بخوبی سبق مل سکتا ہے کہ اگر تم بھی اپنی فکر میں محدود۔ اپنی ضرورتیں کم اور اپنی خواہشیں دل سے نکال دو گے تو تمھیں بھی اصلی خوشی حاصل ہو جائے گی۔ اس لیے کہ اگر تمھیں حقیقت میں خوشی و مسرت کی تلاش ہے تو اُسے عمارت کے محل۔ سلطنت کے دربار اور ظاہری عیش و عشرت کی صحبتوں میں نہ ڈھونڈو بلکہ اُسے غریب کے

جھوٹے مین جا کے تلاش کرو۔ وہ مین ملے گی۔ اور اکثر وہ مین رہتی ہے۔ اس سے صاف ظاہر ہو گیا کہ خدا کے خزانے میں خوشی کی کمی نہیں۔ وہ وہاں کثرت سے موجود ہے۔ اور مین کثرت سے مل سکتی ہے۔ مگر خرابی یہ ہے کہ ہم مین سے اکثر لوگ اپنی نا سمجھی اور غلط خیالی سے اسے ٹھیک جگہ جا کے نہیں دھونڈتے۔ اُن کے دھوکا دینے کے لیے دنیا والوں نے شہوت پرستی کی صحبت کا نام محفل عیش رکھ دیا ہے۔ اکثر مین کے خیال میں یہی ہوتی ہے کہ خوشی صرف ناز و نعمت کے قصرون۔ دولت مند کی ملکیت کے محکون۔ اور حکومت و سطوت کے اداؤں میں رہتی ہے۔ اور وہ مین اُس کے ڈھونڈنے کو وہ جاتے بھی ہیں۔ جس کی بدولت طرح طرح کی ذلتیں اُٹھاتے ہیں۔ مغلوب و مقہور ہوتے ہیں۔ جھوٹ بولنے اور خوشامد کرنے پر مجبور ہوتے ہیں۔ اور ان سب خرابیوں اور تباہیوں کے بدوشت کرنے کے بعد غور کرتے ہیں تو اپنے دل میں خوشی کا نام و نشان بھی نہیں پاتے۔ اس غلط راستے کو چھوڑ کے اگر غربت کے جھوٹوں۔ اور بیکاری کے پھیروں کے نیچے دیکھیں تو وہ اصل بے ہوا ضرور ہاتھ آجائے گا جس کے لیے اُنھوں نے دنیا کے بڑے بڑے عالیشان محل اور زبردست قلعے چھان مارے تھے۔

انسان جس وقت اور جتنی دفعہ اپنے دل میں کہتا ہے کہ ”یہ چیز ملنی چاہیے“ اسی وقت اور اتنی ہی دفعہ ایک فکر اور اُس کے ساتھ ہی ایک غم اپنے لیے پیدا کر لیتا ہے۔ اگر یہ نہ کہے اور اس جملے کے خیال سے اپنے دل کو سجالے تو بہت ہی جلد غم سانسے سے بھاگ جائے گا۔ اور وہ خوشی مل جائے گی جسے تباہی و پریشانی کے ساتھ ذلتیں اُٹھانا اٹھانے کے ہر طرف ڈھونڈنا پھرنا ہے۔

لوگ کہتے ہیں اور عام طور پر مشہور ہے کہ ”پٹ کے لیے انسان ذلیل ہوتا ہے اور اسی کی وجہ سے کبھی اطمینان نہیں نصیب ہوتا“ مگر غور سے دیکھو تو جس قدر سہل الحصول قوت لایوت ہے کوئی چیز نہیں۔ خدا نے چونکہ یہ ایک لازمی خواہش انسان میں پیدا کی ہے۔ اسی وجہ سے اس کے

طرحِ ناک پر انگلی رکھ رکھ کے اور تالیان بجا بجا کے زمانے لہجے اور بازاری عورتوں کے مخزن کے ساتھ شعر پڑھتا ہے۔

ایسے اشعار کی بنیاد ہی چونکہ بدکاری اور بیجائی سے پڑی ہے۔ لہذا عموماً اس قسم کے اشعار میں فحش اور ناپاک اور ذلیل القیاس بہت کثرت سے ہوتے ہیں جنہیں سن کے ہمارے بے غیرت امیر زادے خوش ہوتے اور کھلکھلاتے ہیں۔ کاش عورتوں ہی کا مذاق دکھانا تھا تو شریف ہومیونیون اور پاکہ من اور باعفت خاتونوں کے مذاق کا لحاظ رکھا جاتا۔ مگر نہیں یہاں تو اس سے غرض ہے کہ بیچیا اور بدکار عورتوں کی ادائیں اور ان کی بد اخلاقی و بد اطوار کی حرکتیں دکھائی جائیں۔

افسوس ہماری شاعری پر جو الہام ربانی کا نمونہ بتائی جاتی ہے ان ہرزہ سراؤں کے ہاتھوں ایسا ظلم ہوتا ہے اور یہ مذاق و بدکار امیر زادوں کو اپنے نفسانی جذبات کے سامنے اس کی بھی تیز اور حس نہیں باتی رہتی کہ ایسے شرمناک کلام اور بیجائی کے شعروں سے قوم اسلام کو کتنا بڑا ضرر پہنچ رہا ہے۔ دوسرے ملکوں اور دوسری قوموں کے لوگ جب اس شرمناک کلام کو دیکھیں گے تو انہیں اس کی تو مطلقاً حس نہ ہوگی کہ یہ بازاری عورتوں اور زنانوں کی زبان اور انہیں کی وضع ہے۔ بلکہ وہ یقین کر لیں گے کہ یہ شریف زادوں کے حرکات اور چال چلن کا نمونہ ہے۔ اور پھر ایسا خیال قائم ہو جانے کے بعد اردو بولنے والی عورتوں کی عصمت و عفت غیروں کی نظر میں کس قدر ادنیٰ اور ناقص ثابت ہو جائے گی۔

جس قسم کا ظلم سنجی کی شاعری نے اردو زبان اور اردو شاعری پر کیا ہے ایسا ظلم آج تک سمجھی کسی قسم کے اشعار سے کسی زبان پر نہیں ہوا تھا۔ سلف سے آج تک کسی زبان میں ایسی ناپاک شاعری نہیں پیدا ہوئی تھی۔ جس سے پتہ لگایا جاسکتا ہے کہ کسی قوم میں ایسے بیودہ اور ایسے بیجا شاعر نہیں پیدا ہوئے تھے جیسے کہ اردو میں پیدا ہوئے ہیں۔

اکثر ترقی یافتہ قوموں اور مشہور و معروف زبانوں میں لائق عورتوں نے

اپنے جذبات اور اپنے خیالات اپنی ہی زبان میں ضرور ظاہر کیے ہیں مگر نہایت تہذیب و شائستگی کے ساتھ۔ اس میں شک نہیں کہ عورتوں کی زبان جو عموماً سادی اور گوش ہوتی ہے اور اکثر اس میں ایک خاص قسم کا لوح اور لطف ہوتا ہے شاعری اور انشاء پر دازی کی جان ہے۔ مگر اُسی تہذیب کے ساتھ جس تہذیب سے کہ کوئی پاکہ امن اور عقیقہ عورت اپنے خیالات کو ظاہر کرے۔ یہ نہیں کہ مرد عورتوں کا سادو پٹہ اور ڈھکے اور زنائی صورت بنا کے اپنی شہوت پرستی کی آرزو پوری کریں اور اپنے ناپاک دل کا حوصلہ پورا کریں۔

انگریزی میں انشاء پر دازی کا بہت زیادہ حصہ خاتونان قوم ہی کی قلم سے زینت پارہا ہے۔ جو نیز شاعری کی حیثیت سے اور نیز ناول نویسی کے انداز سے اپنے پاکیزہ خیالات۔ اپنی ستھری زبان۔ اور اپنے تہذیب و شرفیادہ جذبات کو پیلاک کے سامنے پیش کر کے داد خواہ ہوتی ہیں۔ اور قوم اور زبان میں تہذیب و پاکیزگی کی روح بھونکتی ہیں۔ وہاں مرد و عورتوں کی یہ کمر بستہ نہیں کرتے کہ عورت بن کے اور بھاؤ پتا پتا کے بخش بھنے لگیں۔

یہی حالت عربی کی ہے۔ جس میں ہزار ہا شاعرہ عورتیں گزری ہیں۔ انھوں نے اپنی پاک و صاف اور بقول زبان آواز اور داد دینے والوں کے کوڑ میں دھونی ہوئی زبان میں قصیدے بھی کہے ہیں۔ جوش و لالے والے انشاء بھی تصنیف کیے ہیں۔ مگر کبھی یہ نہیں کیا کہ ہجڑوں کی طرح تخرے کرنے اور تالیان بجانے لگی ہوں۔ یا مردوں نے ان کا ہر وہ بھر کے ان کی نہایت ہی بخش اور شرمناک تصویر دکھائی ہو۔

افسوس بہت سے لوگ ہوں گے جو جان صاحب کا دیوان پڑھ کے یقین کرتے ہوں گے کہ لکھنؤ کی شریعت زادیوں کی یہی حرکتیں۔ یہی ادائیں اور ان کے یہی الفاظ ہیں۔ حالانکہ سچ یہ ہے کہ سوا بازاری رنڈیوں کے شریعت عورتوں میں ان الفاظ اور حرکات کا کہیں شان و گمان بھی نہیں ہے۔

اگر عورتوں کے کلام اور ان کی سادی زبان کا لطف دیکھنا چاہتے ہو تو اُمّیوں کو موقع دو کہ اپنے تہذیب اور پاک و صاف خیالات کو اپنی زبان میں ادا

کریں۔ ہمارے یہاں ایک دوسرا ستم یہ ہو گیا ہے کہ جو عورتیں شہر کھتی ہیں وہ مرد استادوں کی تقلید اور موجودہ شعرا کے متبع میں اپنے آپ کو مذکر کی ضمیر دون سے یاد کرتی ہیں۔ صرف یہی نہیں بلکہ وہ مردوں ہی کے تصور اختیار کرتی ہیں اور ان کے دلی جذبات کو اپنی زبان سے ظاہر کرتی ہیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ عورتیں تو شاعری کی دنیا میں آ کے مرد بن جاتی ہیں۔ اور سختی گو مرد شعر کہتے اور پڑھتے وقت عورت بن جاتے ہیں۔ اور سچ پوچھیے تو دونوں نائص اور بہودہ۔ کیونکہ جس طرح مرد کا عورت بننا بالکل خلاف فطرت۔ لغو۔ نامرئیب اور غیر موزون ہوتا ہے اسی طرح عورت کا مرد بننا بھی استہسا سے زیادہ خلاف فطرت اور نازیبا معلوم ہوتا ہے فطرت ہی یہ فیصلہ کر چکی ہے کہ مرد پر مردانگی ہی کی باتیں بھستی ہیں۔ اور عورت پر نسائیت ہی کی باتیں۔ گراؤ و شاعری نے واقعی یہ عجیب و غریب انقلاب پیدا کر دیا ہے۔ کہ اس کی طرف توجہ کر کے عورتیں مرد بن جاتی ہیں اور مرد عورت بن جاتے ہیں۔ پاک سرزمین عرب میں جب کسی عورت نے شعر کہا ہے تو ہمیشہ اپنے آپ کو عورت ہی دکھایا ہے۔ مونث ہی کی ضمیر سے اپنے کو یاد کیا ہے۔ عورت ہی کے خیالات و جذبات باقی رکھے ہیں۔ اور عورت ہی کے الفاظ۔ اور چونکہ وہ پھر مل ہیں لہذا ان میں اثر بھی ملا ہے۔

عباسی خلیفہ بغداد منصفی بائید کے عہد میں بغداد کی ایک صاحب چال حسین و پاک دامن ہارنیں نے جسکا نام سلمی بنت قراطیس تھا یہ شعر کہے تھے :

عُيُونُهَا الْقَرْمُ فِدَاءُ عَيْنِي	واجبا والقباء فداء جيدي
أَزَيْنُ بِالْعُقُودِ وَالْأَنْخَرِي	لَأَزَيْنُ لِلْعُقُودِ مِنَ الْعُقُودِ
وَلَا أَشْكُو مِنَ الْأَوْصَابِ ثَقَلًا	وَتَشْكُو أَمْسِي ثَقُلَ الْهَوَا

عہ جنگی گاؤں کی کالی آنکھیں میری آنکھوں پر قربان + ادھر عورتوں کے گلے میرے گلے کے صدمے۔ عہد میں آرایش کے لیے موتیوں کا ہار پہن لیتی ہوں مگر جتنی لذت ان ہاروں سے میرے سینے کو حاصل ہو سکے اُس سے زیادہ رفق وہ خود میرے سینے سے پاتے ہیں۔

سے ادھر میں سرخیوں کی شکایت نہیں کرتی کہ بھاری ہیں۔ مگر ہاں ہر اداہ سینے کے اُبھار کا لبتہ شامی ہے اس لیے کہ چھاتیوں کے بوجھ سے ٹپک ٹپک جاتا ہے۔

یہ اشعار اس قدر دلچسپ اور پسندیدہ تھے کہ تصنیف ہوتے ہی سارے
 ہندو میں پھیل گئے۔ اور اکثر لوگوں کی زبان پر جاری تھے۔ ہوتے ہوتے خلیفہ مذکور
 یعنی متقی بابت کے گوش گزار ہوئے۔ اُس نے سُن کے اہل دربار سے کہا ”درا
 در یافت تو کرو کہ یہ عورت ایسی ہی ہے جیسا کہ اپنے آپ کو ظاہر کرتی ہے یا فقط
 مبالغہ شاعرانہ ہے۔“ لوگوں نے بخوبی معلوم کر کے عرض کیا کہ ”مصور یہ نازنین
 جتنا کہ ان شعروں سے ظاہر ہوتا ہے اتنی ہی نہیں بلکہ اس سے بھی زیادہ
 صاحب جمال ہے۔“ اس بات کا اطمینان ہو جانے کے بعد اُس نے کہا ”اچھا
 اب تحقیق کرو کہ اس کا چال چلن کیا ہے؟“ یہ بھی دریافت کر کے دربار میں عرض
 کیا گیا کہ ”نہایت ہی پارسا و پاکہ امن ہے۔“ جب یہ بھی معلوم ہو گیا تو متقی نے
 بطور انعام و اکرام کے بہت سارے روپیہ اُسکو بھیج دیا اور کہلا بھیجا کہ ”یہ رقم حقین
 اس غرض سے دی گئی ہے کہ اس سے اپنی عفت و پاکہ امنی کے محفوظ رکھنے
 میں مدد لو۔“

یہ ہے شان سچی شریفانہ شاعری کی۔ اور چونکہ ایک شریف خاتون نے
 ان اشعار کے ذریعہ سے اپنے دل کے سچے جذبات ظاہر کیے ہیں لہذا ان میں
 اثر اور وہ لطف ہے کہ رستخ کے پندہ ہزار دیوان ان کے سامنے بھاڑ کے
 پینک دیجیے۔ الغرض اگر اُدو کو فائدہ پہنچا نا ہے تو یہ کوشش کی جائے کہ
 مرد و عورت جو کوئی شعر کہے اپنے اصلی جذبات و خیالات کو اپنے ہی لہجے اور
 اپنی ہی زبان میں ادا کرے۔ تاکہ کلام میں پورا اثر ہو۔ اور اگر ایسا کرنا اُسے
 پسند یا گوارا نہ ہو تو شاعری کا نام نہ لے۔ اپنی صاقت پر شاعری کے قربان
 کرنے سے کوئی نتیجہ نہیں۔

مانی

ہمارے ملک میں اور ہماری زبان بولنے والوں میں کون ہوگا جس نے
 شعرا کے کلام کو پڑھا ہو اور مانی کا نام نہ سنا ہو جو مسوری اور نقاشی کا سب سے

بڑا کامل نمونہ اور اتنا بڑا بالکل شخص مانا جاتا ہے کہ کوئی مصور چاہے کتنا ہی بڑا
مصور ہو جائے مگر ملک کے خیال میں مانی کے درپے سے نہیں بڑھ سکتا۔ مگر نہیں
کہ سارے ہندوستان میں شاید شاید دوسری کوئی جانتا ہو گا کہ مانی کون شخص تھا
کس زمانے میں تھا؟ کیا کرتا تھا؟ کہاں رہتا تھا؟ اور کون کون کہاں مرا؟
واقعی ہمارے لٹریچر کا یہ بہت بڑا نقصان ہے کہ ہم اُن لوگوں کے حالات سے
بہت ہی کم واقف ہیں جن کے نام بار بار ہماری زبانوں پر آتے ہیں۔ ہمارے
قلموں سے نکلے ہیں۔ اور جو ہماری انشا پر وازی کا زیور بنے ہوئے ہیں۔ وگدائے
نے اس بات کی کوشش شروع کی ہے کہ ایسے تمام لوگوں کے حالات سے پبلک
کو واقف کر دے۔ چنانچہ ہم بہت سے لوگوں کے حالات اسی رسالہ کے صفحوں پر
شائع کر چکے۔ اور اب اس مشہور و معروف نقاش عجم کے سوانح عمری کی طرف
توجہ کرتے ہیں۔

مانی ایک ایرانی نژاد اور مجوسی الاصل شخص تھا۔ اگرچہ اُس کا سن
ولادت ہمیں نہیں معلوم۔ مگر اس میں کچھ کلام نہیں کہ اُس کا نشوونما اور عروج
تیسری صدی عیسوی میں یعنی حضرت محمد صلعم سے تقریباً تین سو برس پیشتر ہوا
اپنے وطن کے اُستادوں سے سکھ کے اور نیز اپنی ذاتی طباعی و مناسبت سے
کام لے کے فن مصوری میں اس درجے کو پہنچ گیا کہ سارے ملک میں کوئی
شخص مہسری کا دعویٰ نہ کر سکتا تھا۔ لیکن اُس کے کمالات صرف اسی فن پر محدود
نہ تھے۔ علمی ذوق نے اسے جتنا بڑا مصور بنایا تھا اتنا ہی بڑا فلسفی اور اسی
درجے کا ہیئت دان اور نجومی بھی بنادیا۔ الفرض علوم فلسفہ اور الہیات میں
غور و تدبر کرنے کے ساتھ اُس نے دنیا کی پولیٹیکل اور سوشل حالت دیکھی۔ اور
کوشش کی کہ ان مذہبی جھگڑوں کو مٹائے دنیا کو ایک اصول کا پابند بنائے
کی کوشش کرے۔

اُن دنوں دنیا کی پولیٹیکل حالت یہ تھی کہ ممالک مشرق میں باوجود بڑی
کوششوں کے دین عیسوی کو کسی طرح کامیابی حاصل نہ ہوتی تھی۔ مغرب میں تو
مسیحیت بحر اعظم مغرب کے سوا حل تک جا پہنچی تھی۔ مگر مشرق کی طرف دین

دین زرتشتی نے اُسے ایسا روکا کہ کسی طرح دریا سے فرات و دجلہ سے آگے بڑھنے نہ پاتی تھی۔ جہان کے سرحدی اضلاع و صوبجات میں پوشیدہ انقلابات کے دامن میں چھپ چھپ کے دین عیسوی اور دین زرتشتی لڑ رہے تھے۔ چنانچہ آرمینیا جو ایران و روم کا سرحدی صوبہ تھا اس قسم کی عظیم الشان معرکہ آرائیوں کا دنگل اور بڑی بڑی سازشوں کا مرکز بن گیا۔ یہاں کا فرمان روا ایک عیسوی داعی کی قیادت میں عیسائی ہو گیا تھا۔ لیکن جب دولت عجم کے ساسانی فرمان روا کو یہ حال معلوم ہوا تو اُس نے اُس مسیحی حاکم کو قتل کر کے پہلی آتش پرستی قائم کر دی۔ اتفاقاً اب سیمیت کے فروغ پانے کا یہ ایک نیا سلسلہ جاری ہو گیا کہ خاص ساسانی خاندان کا ایک شاہزادہ اور ایک شاہزادی جو خسر و دخت کہلاتی تھی کسی پادری کی صحبت میں بیٹھ بیٹھ کے عیسائی ہو گئے اور انکی کوشش سے پھر سیمیت آرمینیا میں فروغ پانے لگی۔ اگرچہ اب بھی تاجداران عجم نے عیسائیوں پر بہت کچھ ظلم و جور کیا مگر اب سیمیت کا قدم آرمینیا میں جم گیا تھا اور اُسکو مٹانا غیر ممکن تھا۔

انقلابات پر کشت و خون اور یہ خوابانہ دیکھ کے مانی کو یہ خیال ہوا کہ کوئی ایسی کوشش کرنی چاہیے جس کی بدولت یہ جھگڑے مٹ جائیں۔ اور ایران و روم دونوں کسی سے اصول کے تابع ہوں۔ ان اصول کو اُس نے اپنے علم و فضل کے زور اور حسن تدبیر سے خود ہی قائم کرنا شروع کیا۔ مگر تاریخ سے بہت سی شہادتیں مل سکتی ہیں کہ ایسی کوششوں کا نتیجہ ہمیشہ یہ ہوا ہے کہ بغرض اسکے کہ مذہبی اختلاف مٹے ایک نیا مذہب پیدا ہو گیا۔ اور جھگڑے بجائے مٹنے کے اور بڑھ جایا کیے۔ چنانچہ یہی نتیجہ مانی کی ان کوششوں کا بھی ہوا۔

اپنے جدید مذہب کو ہنوز تیار اور منضبط نہیں کر چکا تھا کہ اپنی کوششوں میں اثر پیدا کرنے کے لیے اُس نے ارادہ کیا کہ دولت ساسانی میں رواج پیدا کر کے اپنے ہاتھ میں حکمرانی کی قوت پیدا کر لے۔ اور دولت عجم کو بھی اپنے جدید کیش و آئین کا حامی بنائے۔ اور چونکہ بہت بڑا لائق و فائق شخص تھا

ہر جگہ اُس کے علم و فضل کا شہرہ تھا لہذا اس غرض میں اُسے بہت آسانی سے کامیابی ہو گئی۔ اور شہنشاہ ایران شاہ پورا ول کے دربار میں پہنچ کے سارے ملک میں عزت و وقار کی نظر سے دیکھا جانے لگا۔ اب یہ عزت و وقت حاصل کرنے کے بعد مذہب کے متعلق اُس نے اپنے آزادانہ اور مصلحت آمیز خیالات ظاہر کرنا شروع کیے تھے کہ ایران کے تمام کامیون اور ملت زرتشتی کے مقتداؤں نے بڑے زور و شور سے مخالفت کی۔ ایران میں باوجودیکہ شاہنشاہی سلطنت کے آگے ہر شخص کو غلاموں کی طرح سر جھکانا پڑتا تھا مگر مذہب کا زور اس قدر بڑھا ہوا تھا کہ اُس کے مقابلے میں بادشاہ سے بھی کوئی مدد نہ مل سکتی تھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ماتی کو سخت ناکامی ہوئی۔ اور ایسی ناکامی کہ دربار خسروی درکنار وطن کو بھی خیر باد کہنی پڑی۔

مگر ایسی ناکامیاں اس طبیعت کے لوگوں کے لیے عموماً سبک دھڑکتی رہتی ہیں۔ مگر ہمیشہ مفید ہوا کی ہیں۔ ماتی دربار ساسانی سے نکلا تو سیدھا درمن مشرق کو روانہ ہوا۔ پہلے ترکستان میں گیا۔ وہاں کی قوموں اور ان کے مذہب کو دیکھا۔ پھر ہندوستان اور چین کا سفر کیا۔ یہاں کے مذاہب اور ان کے اصول الہیات میں بصیرت حاصل کی۔ بودھ مذہب کی حقیقت دریافت کی برہمنوں کے اخلاقی و مذہبی اصول دیکھے۔ اور ان سب امور میں پورا کمال حاصل کر کے ترکستان میں واپس آیا۔ اور اب یہاں پہنچ کے اُس نے ایک سنسان گھاٹی میں جا کے خلوت اختیار کی۔ اس جگہ ایک شفاف چشمہ جاری تھا اور جابجا میوہ دار درختوں کے موجود ہونے سے کھانے کے لیے بھی پورا اطمینان تھا۔ اس وادی میں وہ کامل ایک سال تک بیٹھا رہا۔ اور اسی خلوت کے میں اُس نے اپنی کتاب آرتھنگ تیار کی۔ اور جس طرح حضرت موسیٰ چالیس دن بعد کوہ طور سے توراۃ کی لوحین لے کے آئے تھے اُسی طرح وہ اپنی اس کتاب کو لے کے برآمد ہوا۔ اور آتے ہی لوگوں سے کہا "میں خدا کے پاس سے آیا ہوں جس نے مجھے مبعوث بہ نبوت کیا ہے۔ اور یہ آسمانی کتاب وہی ہے جس کتاب پر ساری دنیا کو عمل کرنا چاہیے۔" دیگر آسمانی کتابوں

کے خلاف اس کتاب میں تہایت ہی اعلیٰ درجے کی تصویریں بنی ہوئی تھیں۔ جو اُس زمانے کے اعتبار سے اتنی بڑی اعلیٰ چابکدستی اور ایسی صناعتی کا ثبوت دیتی تھیں کہ انسانی قوت سے بالاتر بتائی گئیں۔ اور انھیں کو اُس نے اپنی اُس کتاب کے آسمانی ہونے کا معجزہ اور ثبوت قرار دیا۔

فارسی و اردو شاعری و انشا پر داری میں مافی شخص ایک مشہور مصور ہے۔ غیث اللغات کے مصنف نے خدا جانے کس بنیاد پر اسے ایک روحی نژاد مصور بتایا ہے جو بالکل بے اصل ہے۔ اُس کے حالات میں لکھا ہے کہ اس نے اپنے کمال مصوری ہی کو اپنا معجزہ قرار دے کے دعوے نبوت کیا۔ اُس کے اس کمال کی نسبت مولانا نظامی نے سکندر نامے میں چند ایسے واقعات لکھے ہیں جو غالباً اُن دنوں ایرانیوں میں مشہور تھے۔ کیونکہ قدیم تاریخوں میں اُن باتوں کا کہیں پتہ نہیں۔ وہ لکھتے ہیں کہ مافی نے نقاشان چین کے اعلیٰ کمال نقاشی کا شہرہ سن کے چین کا سفر کیا۔ اُس کی روانگی کا حال چینیوں کو معلوم ہوا تو اُنھوں نے ایک اندھے کنوئین کی تہ میں دجوا سکے راستے میں پڑنے والا تھا، ایک آئینہ بنا دیا جو پانی کا دھوکا دیتا تھا۔ مافی وہاں پہنچا اور پانی اور شیشے کا امتیاز نہ کر سکا۔ چنانچہ پانی نکالنے کے لیے اُس نے اُس کنوئین میں ڈول ڈالا۔ مگر جب ڈول کی بھیس سے شیشہ ٹوٹ گیا تو اسے اپنی غلطی پر بڑی مذمت ہوئی۔ سمجھا کہ چینی مصوروں نے مجھے دھوکا دینے کے لیے یہ چالاکی کی ہے۔ فوراً کنوئین میں اُترا۔ اور اُس شیشے کی جگہ اب اُس نے ایک مرا اور ٹٹرا ہوا گتا بنا دیا۔ جس میں اوپر سے کپڑے بلبلا رہتے ہوئے نظر آتے تھے۔ اور اس صفت سے اسکا یہ مطلب تھا کہ اول تو چینیوں کی سازش کا رد واری کا جواب ہو جائے۔ اور پھر کوئی راہ چلتا اس کنوئین میں پانی کے لیے ڈول نہ ڈالے۔ اسکے بعد جب وہ چین میں پہنچ گیا تو نقاشان چین سے اس کا مقابلہ ہوا۔ قدردان بادشاہ یا امرائے مقابلہ کی یہ صورت نکالی کہ آئینے سامنے کی دود دیوار میں مافی اور چینی نقاشوں کو دی گئیں کہ اُن پر اپنے اپنے فن کا کمال دکھائیں۔ اور درمیان میں ایک دیوار اور اٹھادی گئی کہ جب تک

دونوں طرف کی تصویریں تیار نہ ہو جائیں کوئی اپنے حریف کی کاریگری سے مطلع نہ ہو۔ چینیوں نے بڑی سخت و سرگرمی سے اپنی دیوار کو عجیب و غریب تصویریں کا مرقع بنا دیا۔ مگر مانی نے صرف اتنا کیا کہ اپنی دیوار کو خوب گھونٹ گھونٹ کے آئینہ بنا دیا۔ اور اُس پر ایک پردہ ڈال رکھا۔ جب دونوں نے کہا کہ اب ہم اپنی تصویریں بنا چکے تو ممتحن اور مقابلہ کرنے والے آ کے کھڑے ہو دیوار پر چڑھ کر توڑ دی گئی۔ چینیوں کی صنعت کی تعریف کی گئی۔ اور اب مانی نے اپنی دیوار پر سے پردہ ہٹا دیا تو جو تصویریں چینیوں نے بنائی تھیں اُن کا عکس مقابل کی دیوار پر پڑا۔ اور معلوم ہوا کہ مانی نے بغیر دیکھے اُن کے مرقع کی نقل اس کمال کے ساتھ اتار لی ہے کہ کسی بات میں امتیاز نہیں کیا جاسکتا۔ سبھوں نے اُس کی بے انتہا تعریف کی اور عیش عیش کرتے گئے۔ یہ واقعات اس قسم کے ہیں کہ ان کی ایک کہانی سے زیادہ وقت نہیں معلوم ہوتی۔

بہر حال اس سفر اور اپنی ترکستان کی مذکورہ خلوت گزینی سے فرات کر کے جب وہ ایران میں واپس گیا تو اپنے کو ایک صاحب کتاب پزیر تیار پا گیا۔ اب ایران میں آتے ہی اُسے نمایان کامیابی ہونے لگی۔ بہت سے لوگ اُس کے معتقد و پیرو ہو گئے۔ علماء و رشتہ سے اُس سے بڑے بڑے مناظر ہوئے۔ اس زمانے میں شاہ پور اول دنیا سے رخصت ہو چکا تھا اور اُس کی جگہ اُس کا بیٹا ہر قزین شاہ پور تخت و تاج ساسانی کا مالک تھا۔ ہرمز نے اُس کی بڑی قدر و منزلت کی۔ علم و فضل کی قدر دانی کر کے اس پر نہایت ہی مہربان ہوا۔ اور علاقہ بابل میں آرا بیون نام ایک قلعہ اُسے رہنے کو دیا۔ اس قلعہ میں بیٹھ کر مانی نے اپنے نئے مذہب کی تبلیغ شروع کی۔ اور اس کامیابی کے ساتھ اپنے مذہب کو شائع کرنے لگا کہ ہزار ہا آدمی اُس پر ایمان لے آئے۔ اور مذہب مانوی روز افزون ترقی کرتے لگا۔ مانی کا مذہب باہنی النظر میں دین عیسوی کی ایک شاخ معلوم ہوتا ہے مگر اصل میں وہ دنیا کے تمام مذہبوں سے مرکب تھا۔ بظاہر سمیت کو مذہب حق تسلیم کر کے اُس نے تمام مشرقی مذاہب کے فلسفہ الہی کو اپنا دستور العمل بنا لیا تھا۔ وہ وحدت وجود

کے مسئلہ کا حامی اور مدعی تھا۔ تخلیق عالم کی نسبت کچھ نئے اور عجیب خیالات
 تیار کر کے تھے۔ آتش پرستوں کے اصول کے مطابق انہی بناؤ خداؤں
 یزدان و اہرمین پر قائم کی۔ اور انھیں کے نتیجہ میں نور و ظلمت کی اصطلاحوں
 سے بھی کچھ مذہبی اور روحانی کام لیا۔ حضرت مسیح کی نبوت کو تسلیم کیا۔ اور
 اُن سے پیشتر کے انبیاء خاصہ حضرت موسیٰ کی نبوت سے قطعاً انکار کر دیا۔ جسکی
 وجہ یہ تھی کہ وہ یہودیت سے کسی قسم کا علاقہ نہیں رکھنا چاہتا تھا۔ یہودیت
 میں اس قدر تنگ خیالی تھی اور وہ مذہب ایک قوم اور ایک خاص سرزمین
 سے اس قدر وابستہ تھا کہ وہ تمام نئے بائبل مذہب جنہوں نے حضرت مسیح
 کے بعد دین میں کوئی اجتہاد و تفسیر کرنا چاہا سب کے سب دین موسیٰ کے
 خلاف تھے۔ مانی نے اپنے مذہب کے لیے اخلاقی اصول بالکل بود مذہب
 کے اخلاقی فلسفہ سے لیے۔ اور اسی سلسلے میں بعض بائبل ہندوستان کے
 اس مذہب سے لین جو برہمنوں کا مذہب ہے۔ الغرض مانی کے مذہب کی
 حقیقی شان یہ تھی کہ محسوسیت کے یزدان و اہرمین اور چین و ہند کے اخلاقی
 فلسفہ کو عیسویت کا جامہ بچھا دیا گیا۔ کتاب عہد عتیق (تورہ) کو اُس نے
 شیطانی دوسوئوں کا نمونہ بتایا۔ اور چند اُن انجیلوں کے ساتھ جنہیں مسیحی جعلی
 بتاتے ہیں مانی کی کتاب ارتنگ اس نئے دین کا دستور العمل قرار پائی۔ مگر باوجود
 اسکے کہ مانی نے مختلف مذاہب سے انقاط و انتخاب کیا تھا پھر بھی زرتشتیت
 غالب تھی۔ کیونکہ مانی کہتا ہے "عالم مصنوع اور دو قدیم و ازلی اصولوں سے
 مرکب ہے۔ ایک نور اور ایک ظلمت۔ یہ دونوں اصلی چیزیں اندلی ہیں۔
 ہمیشہ تھیں اور ہمیشہ رہیں گی۔ ان میں ہمیشہ سے حسن۔ عقل۔ اور دیکھنے
 سننے کی قوت تھی اور ہمیشہ رہے گی۔ یہ دونوں باعتبار ذات۔ صورت بھل
 اور تدبیر کے ایک دوسرے کی منہ ہیں۔ اور لمجاظ اپنے اپنے چیز کے ایک
 دوسرے کی مقابل ہیں۔ بسبب اسی طرح جیسے کہ کسی چیز کا سایہ اُسکے مقابل
 رہا کرتا ہے۔ اور جتنی خوبیاں اور بھلائیوں میں سب نور کی طرف منسوب ہیں
 اور جتنی بُرائیاں اور خرابیاں ہیں سب ظلمت کی طرف منسوب ہیں۔"

تاہم مشرقی مذاہب کے ان خیالات و عقائد کے ساتھ اُس نے انجیل سے یہ فائدہ اٹھایا کہ فارقلیط جس کے ظہور کی نشانات حضرت مسیح نے دی تھی اور مسلمان جس کا مور و حضرت محمد (صلعم) کو بتاتے ہیں خود اپنے آپ کو بتایا۔ اور علامہ کہہ دیا کہ ”حضرت عیسیٰ نے میرے ہی آنے کی پیشین گوئی کی تھی۔“

لیکن حیرت کی بات یہ ہے کہ مانی نے اگرچہ اپنے مذہب میں سب سے زیادہ اصول آتش پرستی ہی کو قائم رکھا تھا اگر سب سے زیادہ ضرر اور صدمہ اسے خاص زرتشتیوں ہی کے ہاتھ سے پہونچا۔ نمایاں مجوس اُس کے مخالفت اور دشمن ہوتے جاتے تھے۔ جب تک ہرمزین شاہ پور زندہ رہا اس وقت تک تو اُسے کچھ نقصان نہیں پہونچا۔ اس لیے کہ وہ اُس کا دوست تھا۔ اور اُسی کی ہر بانی سے قلعہ اربابوں میں بیچ کے اُسے اپنے مذہب کو شائع کرنے کا موقع ملا تھا۔ مگر جب ہرمز کے بعد اُس کا بیٹا ہرام شہنشاہ ایران ہوا تو اُسے آتش پرستوں کے موبدون اور دستورون نے اس قدر بھرا کہ وہ مانی کا دشمن اور اُس کے خون کا پیاسا ہو گیا۔ آخر حضرت مسیح کے شہداء پس بعد از حضرت محمد صلیم سے ۳۹۳ء سال پیشتر وہ اپنے قلعہ سے گرفتار کر کے ہرام کے سامنے لایا گیا۔ جس نے یہ نہایت ہی سخت سزا دی کہ زندگی ہی میں اُس کی کھال کھنچالی اور اُس میں بھس بھروادیا۔ مانی کی کھال کا یہ پتلا اپنی منظومی کی تصویر دکھانے اور تعصب مذہبی کے ظلموں کے کارنامے ظاہر کرنے کے لیے ایک مدت تک شہر شاہ پور کے پھاٹک پر جو اُن دنوں ساسانیوں کا دار السلطنت تھا رکھا رہا۔ لیکن مانی نے اپنی زندگی ہی میں اپنے مذہب کو اس قدر فروغ دیدیا تھا کہ اسکے بعد پورے استقلال کے ساتھ قائم رہا۔ اور چند ہی روز میں اُس نے اس قدر عروج حاصل کر لیا کہ کیتھولک مسیحیت یعنی پولوس کے پیروں کے مقابلے میں ایک مستقل اور زوردار مذہب بن گیا۔ اور رومی کلیسیا کا سب سے زبردست حریف بنی فرقہ تھا۔ مانوی لوگ اپنی توحید پر نادان تھے اپنے مخالف عیسائیوں کو مشرک و بت پرست بتاتے تھے۔ اور جو انتظامات کہ رومی کلیسیا کی تردید کے لئے عمل میں آتے تھے وہی انتظامات

زیادہ قوت اور اثر کے ساتھ مانویون مین بھی قائم ہو گئے۔ چنانچہ بارہ بڑے
 عمدہ دار رسولون اور حواریون کے نام سے مسین ہوئے۔ ان کے ماتحت ۷۲
 بشپ یعنی اسقف اعظم تھے۔ پھر ان کے زیر حکم پریسبٹر اور ڈیکن تھے جو سفر
 کرتے اور ہر طرف شہرون شہرون اور قریون قریون دین مانوی کی تبلیغ کرتے
 پھرتے تھے۔

مانی کا قائم کیا ہوا دین مانوی ایک ہزار برس تک دنیا میں قائم رہا۔ اور
 باوجودیکہ روم کی مسیحی شاہنشاہی اور بطرس کے جانشین پاپاؤن نے اس پر
 بڑے بڑے اور طرح طرح کے ظلم کیے مگر کسی طرح انکے مٹانے نہ مٹ سکا۔
 فتوحات اسلام سے بھی اس مذہب کو بڑا ضرر ہونا تھا۔ لیکن اُنکی حکومت میں
 بھی ایک مدت دراز تک زندہ رہا۔ لیکن آخر مسلمانوں ہی کی کوشش سے
 غالباً اس مذہب کا خاتمہ ہو گیا۔
 کتاب ملل و نحل میں علامہ شہرستانی نے مانی کے باب کا نام قاتر تباہی دیا۔

ایک اصلاح

۲۹۔ اپریل کے تہذیب النساء میں مولوی متاثر علی صاحب نے کتاب
 ”تاجدواری“ پر ریویو کرتے ہوئے اُس کی زبان پر دو ایک اعتراض کیے ہیں۔
 جنہیں دیکھ کے لکھنؤ کے اکثر لوگوں نے تہقیر لگایا۔ پہلا اعتراض یہ ہے کہ غرغره
 کی جگہ ”غرارہ“ کا لفظ غلط ہے۔ لیکن ہے کہ مولوی صاحب موصوف کے
 کلام میں یہ لفظ نہ بولا جاتا ہو۔ مگر دہلی و لکھنؤ میں سوا اہلکے مستحون کے
 کئی مقعہ اور تمام خاتونوں کی زبان پر ”غرارہ“ ہی ہے۔ جس کی صحت کا ثبوت
 اس سے زیادہ کیا ہو گا کہ خواجہ حافظ شیرازی فرماتے ہیں:

شے اگر بہ زبان حدیث تو بہ رود

زبے طہارتی آزار ہے ”غرارہ“ کھنم

اور استقبال کی حالت یہ ہے کہ شریعت گھرانوں کی خاتونوں نے غرارہ کے سوا

غرض اس محل پر شاید کبھی سنا ہی نہ ہو گا۔ اسپر طرہ یہ کہ کہ ارشاد ہوتا ہے۔
 بڑے پانچون والے نصیر دار پانچامہ کو ”غزارہ“ کہتے ہیں۔ یہ خدا جانے کس
 نامک کی بولی ہے۔ بڑے پانچون کا نصیر دار پانچامہ نصیر الدین حیدر کے وقت
 لکھنؤ میں ایجاد ہوا۔ اور ہمیں سے اور مقامات میں ہو چکا۔ مگر لکھنؤ میں آج
 تک کسی نے اس پانچامہ کو نہ ”غزارہ“ کہا اور نہ کسی کو کہتے سنا۔ اور نہ یہ دہلی
 کی زبان معلوم ہوتی ہے۔ کیونکہ میں نے کبھی دہلی والوں کو بھی ان منوں میں
 میں غزارہ کا لفظ استعمال کرتے نہیں دیکھا۔

دوسرا اعتراض یہ ہے کہ مولوی صاحب آبلہ اور چھالے کے مقام پر
 ”پھپھولے“ کے لفظ کو غلط بتاتے ہیں۔ حالانکہ ان منوں میں فصیح ترین لفظ
 ”پھپھولے“ ہی ہے۔ ان اعتراضات سے پتہ چلتا ہے کہ ان دونوں حضرات
 عورتوں کی اصلاح و تعلیم کے ذمہ دار بن گئے ہیں۔ وہ زبان اردو سے کہان
 تک نا آشنا ہیں۔ اگر یہ خرابی اسی حد پر ختم ہو جاتی تو کوئی شکایت نہ تھی
 خرابی تو یہ ہے کہ ان کتابوں کو پڑھ پڑھ کے خود ہماری عورتوں کی زبان
 بگڑی جاتی ہے اس لیے کہ جہالت کی وجہ سے انویہ خیال گذرتا ہے کہ جو
 کتابوں میں لکھا ہے وہی صحیح ہے۔

مولانا حالی نے دو چار ہندی الفاظ کمال اُستادی سے بڑی خوبصورتی
 کے ساتھ استعمال کر دیے ہیں۔ اور وہ بھی خاص محل پر۔ اسی طرح مدوح نے
 بعض تصرفات بھی کیے ہیں جو ہمارے نزدیک قابل اعتراض نہیں۔ مگر انکی
 تقلید میں بعض فوخیہ شعرا ایسی بڑی طرح بے موقع و محل ہندی لفظوں کو
 استعمال کرنے لگے ہیں اور ان کے ہاتھوں اردو الفاظ پر ایسے بھونڈے
 تصرفات ہو جاتے ہیں کہ زبان اردو تباہ ہوئی جاتی ہے۔ سو مئی کے انسٹی ٹیوٹ
 گزٹ میں چودھری خوشی محمد خان صاحب ناظر کی ایک نظم ہے۔ اس کے چوتھے
 شعر کا دوسرا مصرع ہے ”جام گدا فی ہاتھ میں لیکر دو ارے دو ارے پھرتے ہیں“
 یہ ”دو ارے دو ارے“ اردو کی جان پرستم کا اتنا بڑا پھاڑ ہے کہ خدا ہی ہے
 جو وہ جان برہو سکے۔ پانچون شعر کا دوسرا مصرع ہے

”جسکے اثر سے خستہ رگوں میں خون کے فوارے پھر رہے ہیں“
 یہ ”فوارے“ کو تصرف کر کے ”فوارے“ بنادینا بھی زبان پر کوئی مہوئی ظلم نہیں۔

پھر وہی اصلاح زبان

رسالہ تیارواری اس وقت تک سیری نظر سے نہیں گزرا ہے۔ اُسکے الفاظ پر مولوی ممتاز علی صاحب کی غلط نکتہ چینیوں سے میں نے اختلاف کیا تھا جسکو مولوی صاحب اس پر محمول فرماتے ہیں کہ وہ میرے دوست کی کتاب ہے۔ مگر یہ اُن کا حسن ظن ہے۔ میں اُس کتاب کی غلطیوں پر بھی اسی طرح معترض ہوں جس طرح اُس کے متعلق نکتہ چینیوں کے خلاف ہوں۔ مولوی صاحب نے ”غرغره“ کی جگہ غرارہ کے لفظ کو غلط بتایا تھا۔ میرے اعتراض کا ماحصل یہ تھا کہ غرغره و غرارہ دونوں صحیح ہیں لیکن اُردو میں غرارہ ہی فصیح ہے۔ لفظ غرارہ کی صحت کے ثبوت میں میں نے خواجہ حافظ کا شعر بھی نقل کر دیا تھا۔ اور کہا تھا کہ ہندوستان میں غرغره صرف اطبا کے نسخوں میں نظر آتا ہے۔ مگر مولوی صاحب کو اس پر اطمینان نہیں ہوا۔ فرماتے ہیں کہ تیارواری طب کی کتاب اور زبان اطبا کی تابع ہے۔ اور یہ نہیں خیال کرتے کہ نسخوں کی زبان اطبا فارسی ہے اور ”تیارواری“ اُردو میں لکھی گئی ہے۔ علی ہذا البتاس ”چھا کا“ ”آلمہ“ اور ”پھپھولا“ سب صحیح ہیں مگر اُردو میں ”پھپھولا“ فصیح ہے۔ لیکن ”پھپھولا انگیز“ بالکل غلط ہے۔ اور اسی غلطی ہے جو کسی طرح قابل معافی نہیں۔ سینکڑوں کی جگہ سکا کی کڑا بھی بیشک غلط ہے اور یہ اعتراض مولوی صاحب کا صحیح ہے۔

قبرستانوں کا مسئلہ

لکھنؤ میں میونسپلٹی کی عنایت سے قبرستانوں کا مسئلہ روز بروز تکلیف دہ

ہوتا جاتا ہے۔ اور افسوس کہ مسلمان خبر نہیں ہوتے۔ شہر کے تمام قبرستان بند
 کر دیے گئے ہیں۔ جو قبرستان کھلے ہوئے ہیں وہ آبادی سے اتنی مسافت پر ہیں
 کہ جنازوں کا لیجانا ناممکن ہی دشوار ہو گیا ہے۔ چند ہڑواڑین جا بجا شہر میں
 خاص خاندانوں کے لیے کھلی ہوئی ہیں۔ مگر ہمارے ممبران بورڈ کو وہ بھی ٹھٹک
 رہی ہیں۔ چنانچہ فی الحال اُن کی فہرست تیار کی گئی ہے۔ اور
 ارادہ ہے کہ اُن سب ہڑواڑوں کو بھی مطلقاً بند کر دیا جائے۔ اُس پر طرہ یہ ہے
 کہ وکٹوریہ گنج کے قریب جو عام قبرستان دیا گیا تھا وہ بھی جگہ نہ رہنے کے باعث
 بند ہونے والا ہے اور تجویز کی جا رہی ہے کہ کسی ایسی جگہ جو تال کٹورے کی کربلا
 سے بھی میل دیکھ میل آگے ہے جگہ دی جائے۔ اگر یہی ارادہ ہے تو ہماری
 میونسپلٹی کے جنازوں کے وہاں لیجانے کے لیے آدمی بھی دینے چاہئیں۔
 افسوس اس بات کا ہے کہ ممبران میونسپلٹی منتخب ہوتے وقت ووٹ لینے
 کو تو ہمارے پاس آتے ہیں اور ہم پر ہر قسم کے اخلاقی دباؤ ڈالتے ہیں۔ مگر
 ایسی کارروائیوں کے وقت بغیر بہین خبر کیے کارروائی کرنے کو تیار ہو جاتے
 ہیں۔ جو فیصلہ چاہتے ہیں کر دیتے ہیں اور اسکا ذرا بھی اندازہ نہیں کرتے
 کہ اُن کی بے پروائی سے ہم کس مصیبت میں مبتلا ہو جائیں گے۔ ہم مذہب تھے
 ہیں اور اپنے مردوں کو گورنمنٹ سمجھتے کہ انھیں شہر سے باہر لیجا کر پھینک
 آیا کریں۔ ہم اپنے عزیزوں اور دوستوں کی قبروں پر فاتحہ پڑھنے کو جاتے
 ہیں۔ ہم اکثر اُن پر جا کے چراغ روشن کرتے اور پھول چڑھاتے ہیں۔ اگر
 میونسپلٹی کی یہ عنایت رہی تو اس سارے فاتحہ اور دُرو کا سلسلہ ہی
 ختم ہو جائے گا۔ مسلمانوں کو مستردی سے اٹھ کے کوشش کرنا چاہیے۔ ورنہ
 پھر کچھ نیا نہ بنے گی۔ ساری ہڑواڑین بند ہو جائیں گی اور ادنیٰ و اعلیٰ
 سب کو اپنے عزیزوں کی لاشیں ایسی جگہ لیجا کے پھینکا پڑیں گی جہاں دفنانے
 کے بعد پھر کسی کا گڑہی نہ ہو۔ یہ جو آئے دن پولیسکل طے ہوا کرتے ہیں اُن
 سب سے اہم ہی مسئلہ ہے۔ اور اگر اس وقت غفلت برتی گئی تو پھر کچھ بنانے
 نہ بنے گی اور سوا اچھٹانے اور اپنی بدقسمتی پر رونے کے کچھ نہ کر سکیں گے۔

لہجہ افسیر یورپین ہیں اور اُنکے اسٹنڈٹ ایک نو عمر ہندو ڈاکٹر۔
 ہی ودا افسیر ہیں جن کے ہاتھ قبرستانوں اور مسلمانوں کے دفن ہونے کا فضیلہ
 ہے۔ قبرستانوں کا معاملہ لازم ہے کہ کسی مسلمان کے ہاتھ میں رکھا جائے جو مسلمانوں
 کے خیالات مذاق اور مذہبی ضروریات کو بخوبی سمجھتا ہو۔ ہندو ڈاکٹر صاحب
 کے خیال میں یہ ہے کہ جب ہندو اپنی لاشوں کو دُور لے جاتے ہیں تو مسلمان
 کیون نہ لیجا رہیں۔ لیکن اسکا جواب یہ ہے کہ آپ براہ کرم ہندو دن کی دشواریا
 بھی دور کیجیے اور ایسا انتظام فرمائیے کہ اُنکو بھی تکلیف نہ ہو۔ یہ تو نہایت
 ہی بُرا اصول ہے کہ چونکہ ایک گروہ تکلیف میں مبتلا ہے لہذا دوسرے کو بھی
 خواہ مخواہ مبتلا کیا جائے۔ ہندو شاید اپنی خوشی سے دور لیجاتے ہوں۔ کیونکہ
 اُن کے مسان میں کوئی تبدیلی نہیں ہوتی ہے۔ پُرانے زمانہ سے جہاں تھسا
 وہیں اب بھی ہے۔ جلات اسکے مسلمانوں پر یہ نئی مصیبت پڑی ہے جسکے وہ
 کبھی عادی نہ تھے۔ ہم اسید کرتے ہیں کہ ہمارے روشن خیال ہندو ڈاکٹر
 صاحب سچاے اسکے کہ مسلمانوں کے مُردوں کی مٹی خراب کرین ہندو دن
 کے لیے آسانی اور سہولت پیدا کرین گے۔

یہ امر بھی قابلِ لحاظ ہے کہ سرکار کی جانب سے جو زمینیں قبرستان کے
 لیے دی گئی ہیں اُن میں قبروں کا سلسلہ کچھ اس ترتیب سے رکھا گیا ہے کہ
 ایک دفعہ دفن کر آنے کے بعد پھر تہ نہیں چلتا کہ وہ قبر کہاں ہے اور کون
 سی ہے۔ مسلمان قبرستانوں میں بھی ہنڑواٹکے عادی ہیں۔ ہر شخص چاہتا ہے
 کہ اپنے عزیزوں کے پاس دفن ہو اور اُسکے بال بچے اور عزیز واقارب
 قبرستان میں بھی ایک مقام پر رہیں۔ مگر ان قبرستانوں میں یہ حالت ہو رہی
 ہے کہ کسی کو خبر ہی نہیں رہتی کہ کون کہاں دفن ہے۔ یہ شکایتیں ایسی نہیں
 ہیں کہ ان کی جانب سے بے پروائی کی جائے۔

افسوس کہ مسلمان اپنی ضرورتوں سے خود ہی غافل ہیں۔ اُن کا کام
 ہے کہ چندہ کر کے اپنے لیے دو تین عمدہ قطعات زمین جو شہر کے مختلف طبقوں
 سے قریب ہوں قیمت دے کے مہیا کرین اور اُن کا انتظام اپنے ہاتھ میں

رکھیں۔ اس میں نہ کسی بڑے سرمایہ کے ضرورت ہے اور نہ کوئی دشواری ہے۔ ان قلعوں میں مالی نوکر رکھ کے قبرستانوں کو گلزار بنا دیا جاسکتا ہے اور نہایت سہولیت کے ساتھ۔ کیونکہ ان باتوں کا صرف قبرستان ہی سے یہ آسانی نکل سکتی بشرطیکہ تنکیہ داروں کے عوض کوئی دیدار اور تعلیم یافتہ حضرت اُن نئے قبرستان کا انتظام اپنے ہاتھ میں رکھیں۔ علمائے فرنگی محل یا مذوۃ العلماء کو اس جانب توجہ کرنی چاہیے۔ ورنہ ہم پیشین گوئی کیے دیتے ہیں کہ عنقریب مولوی نوار صاحب کا باغ بھی بند ہوا جاتا ہے۔ مگر سب سے پہلی کارروائی یہ ہونی چاہیے کہ شہرین دو ایک جگہ عام جلسے کر کے میونسپلٹی کو تمام ہٹوا ڈون کو بند کرنے اور اسی دور قبرستان تجویز کرنے سے روکا جائے۔ ورنہ غضب ہو جائیگا۔

قسمت زبان اردو

ہمارے اس مضمون پر بعض احباب کو بدگمانیاں بھی پیدا ہوئیں۔ مگر ہم اُن محبین یقین دلاتے ہیں کہ یہ ہم اُنکے خلاف ہیں اور نہ یہ سمجھتے ہیں کہ اردو دہلی و لکھنؤ کی قید سے آزاد ہوگئی۔ لیکن ہاں اُن لوگوں کی تنگ خیالی و محفلت کے ضرورت شاکہ ہیں۔ اس امر کو کسی آئندہ موقع پر ہم زیادہ وضاحت سے لکھیں گے۔ سر دست اس بات کی ضرورت ہے کہ اسی سلسلے میں جن خیالات کا ظاہر کرنا باقی رہ گیا ہے اُن محبین پر اور ابیان کروں۔ اور حقیقت یہیں جو سب سے اہم بات بتانی ہے وہ ابھی تک نہیں بیان کی گئی۔

اردو پر جو سب سے بڑی آفت نازل ہوئی ہے وہ مختلف مصنفین اور انشاپروہانوں کا اختلاف مذاق ہے۔ کسی ملک اور کسی زبان کا تحریر بھی ایک رنگ کا پابند نہیں رہا۔ جس طرح شاعری میں نیز بلحاظ زبان اور نیز بلحاظ خیالات جدا جدا رنگ ہوا کرتے ہیں اُسی طرح نثر انشاپروہانوں میں بھی ہوتے ہیں۔ عربی۔ انگریزی۔ فارسی۔ جس زبان کے لڑبچہ کی طرف توجہ کیجیے یہی شان نظر آئے گی۔ بلکہ غور کرنے کے بعد آپ کو تسلیم کرنا پڑے گا کہ جس زبان

میں لٹریچر کے جتنے زیادہ مختلف رنگ ہیں اُسی قدر وہ زبان زیادہ ترقی یافتہ ہے۔
 اُردو نے جب ترقی کی دنیا میں قدم رکھا تو اُس میں بھی لٹریچر کے جدا جدا
 رنگ پیدا ہونے لگے۔ کسی مصنف میں یہ شان نظر آئی کہ وہ سادہ سی روان
 اور بامحاورہ زبان کو پسند کرتا ہے۔ کسی میں یہ مذاق کہ نئی تشبیہات و
 استعارات اور طرح طرح کے دلچسپ استعاروں کا گرویدہ ہے۔ اور کسی
 میں یہ دُھن پانی گئی کہ تازک مضامین اور باریک و دقیق خیالات ضرور
 ہونے چاہیے۔ یہ بھی چھوڑ دیجئے۔ اُردو نے چونکہ فارسی کے نقش قدم پر
 چل کے نشوونما پائی تھی اور اب اُس پر انگریزی لٹریچر کا اثر پڑنے لگا تھا
 لہذا ایک یہ اختلاف مذاق پیدا ہوا کہ بعض انشاپرواز اُسے پرانے فارسی
 رنگ میں رکھنا چاہتے ہیں۔ اور کوشش کرتے ہیں کہ فارسی کی طرح اس میں
 مبالغے ہوں۔ مراد الفاظ لائے جائیں۔ اور ایک ہی خیال و مضمون
 جدا جدا الفاظ اور نئی بندشوں میں دکھایا جائے۔ ان لوگوں کے مقابل
 مصنفین کے ایک اور گروہ کا خیال ہے کہ ہمیں انگریزی طرز تحریر کی طرح اُردو
 میں نہ مبالغہ ہو نہ مرادف الفاظ ہوں۔ بلکہ ہر فقرے اور ہر بیان میں نیچر کی
 جھلک نظر آتی ہو۔

اُردو انشاپروازی میں ان اختلافات اور جدا جدا مذاقوں کا پیدا ہونا
 و حقیقت زبان کی ترقی کی دلیل تھا۔ مگر نفاق اور بھوٹ چونکہ ہندوستان کی
 سرشت میں داخل ہے اور ہماری رگ و پے میں سرایت کیے ہوئے ہے لہذا
 ہمارے یہاں ان مبارک اختلافات مذاق سے بھی یہ سوخت نمایاں ہوئی کہ
 ہر رنگ کا پسند کرنے والا دوسرے مذاق والے کی زبان بند کرنا چاہتا ہے
 اُس کی بُرائیاں کرتا ہے۔ اور اُس کے عیب نکال نکال کے نہایت ہی ناپاک
 اور حاسدانہ طریقہ سے پبلک پر پیش کرنا چاہتا ہے۔ ہر ایک کے خیال
 میں لٹریچر وہی ہے جسکو وہ پسند کرتا ہے۔ اور دوسرا جو کوئی لکھتا ہے
 اُس میں چاہے کتنی ہی محنت کرے اور کتنے ہی کمال دکھائے وہ مٹانے
 ڈوبنے اور جلا دیے جانے کے قابل ہے۔

انگریزی میں ایک طرف کار لائل کو رکھو اور دوسری طرف مکالے کو۔
تو کتنا تضاد نظر آتا ہے۔ مگر دونوں کے کلام سب لوگوں کے نزدیک اعلیٰ
درجے کے لٹریچر کمالات مانے جاتے ہیں۔ عربی میں ایک طرف تاریخ تیموری
اور ابن شداد کی عبارتوں کو رکھو اور دوسری طرف الف لیله کو تو زمین و
آسمان کا فرق معلوم ہوگا۔ مگر اسکو سارا زمانہ مان رہا ہے کہ دونوں عربی انشا
پر دازمی کا اعلیٰ زیور ہیں۔ فارسی میں ایک طرف درۂ نادرہ کو رکھو اور
دوسری طرف افوار سہیلی کو تو ایک کو دوسرے سے کچھ بھی نسبت نہ ہوگی۔
مگر اہل زبان اور قدروان زبان نے دونوں کو بالکمال مانا اور دونوں کی
قدر رکھی۔

ہاں اردو کی انوکھی دنیا میں یہ حالت ہے کہ چھوٹے چھوٹے ادیبوں
درجے کے لکھنے والے درکنار بڑوں بڑوں اور مستند و قابل تعریف انشا پردازوں
کی یہ حالت ہے کہ ایک میراجن کی چار رویش کو برا بتاتا ہے اور دوسرا
سرو کے فنانہ عجائب کے نام رکھتا ہے۔ کوئی مولوی نذیر احمد کے کلام کا
گرویدہ ہے تو وہ اور سارے لکھنے والوں کو زبان کا بگاڑنے اور غارت کرنے
والا سمجھ رہا ہے۔ کوئی مولوی محمد حسین آزاد کی انشا پر دازمی کا معرفت ہے
تو اور سب مصنفوں کی عبارت کو مجذوب کی بڑے زیادہ وقت میں دیتا۔
ایک صاحب نیڈت رتن نامہ سرشار کی عبارت کے دلدادہ میں تو وہ حالی
اور آزاد سب کو اُن کے اوپر قربان کیے دیتے ہیں۔ اسی مخالفت کا ایک
کرشمہ یہ بھی نظر آ رہا ہے کہ شمس العلماء خواجہ الطاف حسین صاحب حالی
باوجود اپنی متانت اور خاموشی کے رہ رہ کے چھڑے جاتے ہیں۔ وہ
چاہیں بولیں یا نہ بولیں مگر لوگ اس کو شش میں جان دے دیتے ہیں کہ
کہ جس طرح نے اُن کی شہرت و ناموری کو مٹا کے رکھ دیں۔ مگر اسکے ساتھ
ہم یہ بھی کہیں گے کہ باوجود اس متانت و نیک نفسی کے غالب کی سو انگریزی
کے مقدمہ میں ہمارے خواجہ صاحب بھی اس جذبہ سے نہ بچ سکے۔
اب اس سے بھی بڑھ کے ایک نیا اختلاف ناولوں کی کثرت

اور اُن کی اشاعت میں روز افزون ترقی ہوتے دیکھ کے پیدا ہوا ہے۔ جسکی اصلی بنیاد یہ ہے کہ بعض حضرات میں فلسفیانہ مذاق بڑھا ہوا ہے۔ بعض اخلاقی کتابوں کے گردیدہ ہیں اور بعض محض مورخ ہیں۔ وہ حسب یہ دیکھتے ہیں کہ اُن کی یا اُنکے مذاق کی کتابوں کی اُس قدر اشاعت نہیں ہوتی جتنی کہ ناولوں کی ہوتی ہے تو اپنے اُس غصہ کو موج بنانے اور مذہب پیرایہ میں ادا کرنے کے لیے یہ دعوے کرتے ہیں کہ ملاک کا مذاق بگڑا ہوا ہے اور ناول نوجوانوں کے اخلاق کو بالکل غارت کیے دیتے ہیں۔ حالانکہ سب کو معلوم ہے کہ یہی ناول اور اسی طرح کے عاشقانہ مذاق کے ناول ہیں جنہوں نے یورپ کو اتنی ترقی دلائی۔ اور گذشتہ یورپ کو موجودہ یورپ بنا دیا۔

ہندوستان میں جہاں تفاق کا مادہ بڑھا ہوا ہے وہاں یہ بھی ایک عجیب خاصیت ہے کہ جہاں کسی بڑے اور مستند و معتبر آدمی نے کوئی بات کہی سب لوگوں نے بے سوچے سمجھے مان لیا۔ اور اسی کی تقلید میں بلا لحاظ اس کے کہ اُس مسئلے پر کچھ غور بھی کریں غل مچانا شروع کر دیا۔ چنانچہ دو ایک صاحبوں کی تقلید میں سب نے یہی کہنا شروع کر دیا۔ اور بزرگی سادہ لوحی سے یہ سمجھ گئے کہ ناولوں کی مخالفت کرتے ہیں پبلک کو یہ معلوم ہو گا کہ ہم بہت ہی متین اور عالمانہ مذاق کے آدمی ہیں۔ اس غیر معمولی ہنگامے سے یہ حرکت ظاہر ہوئی کہ اکثر تعلیم یافتہ حضرات یہ سمجھنے لگے کہ ہم نے علانیہ طور پر کسی ناول کو پڑھا اور ہماری لیاقت و متانت میں بڑھ لگ گیا۔ دوسری یہ بھی سب جانتے ہیں کہ ناول اُس قسم کا لٹریچر ہے جو اتنا سے زیادہ دلچسپ ہوتا ہے۔ جسکے پڑھنے میں دماغ پر کسی قسم کا بار نہیں پڑتا۔ اور دماغ کی تھکن مٹانے اور فرصت کے اوقات میں دل بہلانے کے لیے اُس سے زیادہ موزون کوئی لٹریچر نہیں ہو سکتا۔ ان دونوں متضاد خیالوں کی یہ بہت نمایاں ہوئی کہ جس طرح ایک انگریزی ناول نویس نے ایران کی یہ حالت دکھائی ہے کہ بڑے بڑے مقدس لوگوں کی پراپٹ خواہنگاہوں میں شراب کی بوتلیں رکھی ہوئی ہیں۔ اور عام مجمع میں وہ زہر و تقویٰ کا وعظ کہہ رہے ہیں۔ اُسی طرح

پہان کے بڑے بڑے مستند کیرکٹر کے لوگوں کا یہ عالم ہے کہ گھر کے اندر سب سے چھپ کے عام مذاق کے ناولوں کو پڑھتے ہیں۔ اور باہر نکل کے ملنے جلنے والوں سے کہتے ہیں کہ مجھے ناول سے سخت نفرت ہے۔ اور چنانچہ ناولوں کو پڑھتے وہ نہایت ہی ناپاک شخص ہے۔ اس مضمون کا باقی حصہ آئندہ نمبر میں مکمل کو پہنچے گا۔

(۲)

ہم اپنے اس مضمون کو ختم نہیں کرنے پائے تھے کہ ایڈیٹر صاحب ہندوستان کا ایک ریپارٹ دیکھ کے ہمیں پھر انہیں باقون کی طرف توجہ کرنا پڑی جن پر بحث کر چکے ہیں۔ ہم نے ناولوں کے متعلق جو کچھ لکھا تھا اُس پر ہمارے دوکل بمصر بہت چمکے ہوئے۔ شاید اُنکو اس کی خبر نہیں کہ انگریزی انشاپوری کے اصلی سنبھالنے والے اُس زبان کے ناول اور ڈراما ہیں۔ ان کی ابتدا وہاں مذہبی پہلو سے شروع ہوئی اور آخر میں ملک کے اخلاق و عادات اور تمدن و معاشرت بلکہ بعض مواقع پر پالکس پر بھی انہیں کی حکومت ہو گئی۔ انگلستان میں بائبل کے بعد جو کتاب سب سے زیادہ قابل قدر و عزت سمجھی جاتی ہے وہ شکسپیر کے تصانیف ہیں۔ شکسپیر کی اخلاق کا اول درجہ کا علم اور زبان کا سب سے بڑا پیغمبر مانا جاتا ہے۔ اور اس کے بعد اسکاٹ اور ڈیکینس کے ناول ہیں۔ انگلستان شکسپیر اور ان دیگر مصنفوں کی قدردانی کرتا ہے بلکہ پرستش کرتا ہے۔ اور انگریزوں کی تقلید میں ہم اپنے ہندوستان کے انگریزی اسکاٹز کو بھی شکسپیر کے تصانیف پر عشق کرنے دیتے ہیں۔ جو اعلیٰ درجے کے سلسلہ تعلیم میں بھی بار بار داخل کر دیے گئے ہیں۔ اب ہم سوچتے ہیں کہ کیا شکسپیر کے ڈراما یا ڈیکینس کے تصانیف میں جو انگلستان کا سب سے زیادہ مذہب ناولسٹ مانا جاتا ہے حسن و عشق کے جذبات نہیں ہیں؟ ان نئے اور عجیب الخلق ہندوستانی مصلحان اخلاق کا یہ فلسفہ آج تک سیری سمجھ میں نہیں آیا کہ رومنجو لٹ کا عشق تو اخلاق کو بنادیا کرتا ہے مگر دنیا لڈز کے ناولوں سے اخلاق بگڑ جاتا ہے۔ ڈیکینس کے ڈیوڈ کا پر فیملی کی خوبصورت

ہیروین ڈورا اور ایگنس پر عشق کرنے سے تو انسان انسان کا ل بن جاتا ہے
 مگر ریٹالڈز کی ایگنس اور ایو جن کے حسن پر نظر ڈالی اور آدمی گنہگار ہو گیا۔
 اب اس زمانے میں وہاں ناول نویسی کو اس قدر ترقی ہو گئی ہے
 کہ جتنے سوسائٹی پیسز ہیں عام اس سے کہ اعلیٰ ہوں یا ادنیٰ کوئی ناولوں
 سے خالی نہیں۔ صد ہا ہفتہ وار اور ماہوار ایسے رسالے نکل رہے ہیں
 جن میں سرت ناول ہی ہوا کرتے ہیں۔ مشہور و معروف پبلیک اخباروں
 کے صفحات پر بھی بعض بعض اوقات ناول نظر آ جایا کرتے ہیں۔ یہ کیوں؟
 محض اس سبب سے کہ اخلاقی تعلیم دینے کا کوئی اس سے زیادہ دلچسپ
 طریقہ آج تک دنیا کو معلوم نہیں ہوا۔ اور ساری قوم نے تسلیم کر لیا ہے کہ
 ناول ہی اخلاق کے اصلی مصلح ہو سکتے ہیں۔ اسکا اصلی سبب یہی ہے کہ
 جس کو ہم بیشتر بھی جتا چکے ہیں کہ انسان کے لیے ناول سے زیادہ دلچسپ
 کوئی چیز نہیں ہے۔ فطرت انسانی اسکو ڈھونڈھتی ہے۔ اور اسی کے

عے بیشک ریٹالڈز کے ساتھ انگلستان کو ایک قسم کی نفرت سی ہے جس سے ہمارے
 ایمان کے بعض انگریزی دان اپنی سطحی واقفیت سے یہ رے قائم کر لیتے ہیں کہ اسکے
 تصانیف سے اخلاق بگڑتا ہے۔ حالانکہ انگریزوں کی نفرت کا اصلی سبب کچھ اور ہی ہے
 ریٹالڈز ان لوگوں میں تھا جو سلطنت کے مخالف ہیں۔ امارت اور شاہی کو خدا کا نائب
 تصور کرتے ہیں۔ اور انگلستان کی پبلک کا مذاق شاہی سطوت اور امارت و شوکت
 کا ایسا دلدہ ہو گیا ہے کہ اب لوگ امپیرلزم کے اصول کو اختیار کرتے جاتے ہیں
 اور لیبرل پارٹی بالکل کمزور ہو گئی ہے۔ اور چونکہ یہ پبلیک اخلاقیات اس سرزمین
 میں مذہب کی شان سے نمایاں ہوتے ہیں اور باہمی تعصب کو ترقی ہوتی جاتی ہے۔
 لہذا انھیں ریٹالڈز ہر طرح برا نظر آئے لگا۔ اور ظاہر ہے کہ عیب اس نے امپیرلزم
 پر عام طور پر نفرت ملامت کی تو عموماً امیروں کے طرفدار اس سے نفرت بھی کرنے لگے۔
 مگر باوجود اس کے اسکے تصانیف کو انگلستان کے بہت کم لوگ ہیں جو نہ پڑھتے ہوں اور
 اسی وجہ سے اسکی کتابوں کے ایڈیشن لاکھوں کی تعداد میں طبع ہوا کرتے ہیں۔

دامن میں اخلاق کو چھپا کے یا پسند و نصائح کو ناول کا لباس بچھا کے پیش کیا
جلئے تو نہایت ہی عمدہ اور مفید اثر پڑتا ہے۔ اس خیال نے وہاں کے
علماء و فضلا درکنار مقتدا ایمان دین مورخین اور فلسفیانہ مذاق والوں تک کو
اس بات پر آمادہ کر دیا کہ اپنے خیالات اور خشک مسائل کو ناولوں کے
ذریعہ سے پالاکا اور قوم میں پھیلاؤ میں نتیجہ یہ ہوا کہ ناولوں کو جو دلچسپی اور
مقبولیت حاصل تھی وہ صد ہا درجہ بڑھ گئی۔

ہمارے یہ ہندوستانی مصلح فرماتے ہیں کہ اردو ناولوں کو انگریزی
ناولوں سے کوئی نسبت نہیں۔ یہاں بہت ہی کم استعداد والے
اور بہت ہی ناقابل لوگ ناول نویسی پر آمادہ ہو گئے ہیں۔ اور ایسے ناول
پبلک میں شایع کئے ہیں جو اخلاق کے بگاڑنے والے اور شہوت پرستی کے
جذبات سے بھرے ہوئے ہیں۔ اور وہ ملک کے لیے نہایت ہی مضر ہیں۔ اس
کے متعلق اول تو میں یہ کہوں گا کہ انگلستان کے مہذب سے مہذب ناولوں
میں بھی اسی قسم کے جذبات ہیں۔ اور گو پہلے کہ چکا ہوں مگر پھر کہتا ہوں کہ
کوئی وجہ نہیں کہ گوڈ اسمتھ کے ”ویکارات و کیفیلٹ“ میں اس کی بیٹی ایلویا
کا بھگنا لیجا یا جانا تو ایک بڑا اخلاقی مسئلہ ہو اور پھر اس کوئی معاصر اردو میں
کسی زمانہ اسکول کے مدرسہ کے خراب یا بے پروا ہونے کے نتیجہ میں یہ
دکھلا دے کہ کوئی لڑکی کسی کے ساتھ چلی گئی تو وہ بہت بڑا اخلاقی جرم اور
شہوت پرستی کا سبق خیال کیا جائے۔ شاید کوئی صاحب یہ کہیں کہ ناولوں
میں عشق کے جذبات ہی نہ دکھلائے جائیں۔ تو میں یہ کہوں گا کہ جن صاحب
کا یہ خیال ہو وہ ہی نہیں جانتے کہ ناول کیا چیز ہے۔ ناول کے لیے سب سے
مقدم یہ ہے کہ وہ اتنا سے زیادہ دلچسپ ہو اور دلچسپی بغیر حسن و عشق کے
بہت ہی کم آ سکتی ہے۔ قطع نظر اس کے انسان کی زندگی کا سب سے اہم
معاملہ ہی عشق اور شادی ہے۔ زندگی کے بننے اور گڑنے کا اصلی دار و مدار
اسی پر ہے۔ لہذا اسی کے متعلق عمدہ سبق دینا ناول کا سب سے پہلا فرض
ہے۔ اور یہی سبب ہے کہ آپ یورپ کے ناولوں میں بہت کم ایسے پائیں گے

جن میں حسن و عشق کی چاشنی نہ پائی جاتی ہو۔
 اس کے بعد بھی ابھی یہ کہنے کی گنجائش باقی ہے کہ ”اُردو ناول زیادہ
 ایسے ہیں کہ نہ اُن کی عبارت اچھی ہے نہ خیالات اچھے ہیں۔ مبتدل محاورات
 اور رکیک خیالات کے سوا اُن میں کچھ نہیں ہوتا۔ اسکو میں مانتا ہوں۔ مگر
 انگریزی ناولوں میں جن ناولوں کی آغ کثرت ہے وہ بھی اکثر ایسے ہی
 ہوتے ہیں۔ اور اُن میں سوارکیک خیالات اور کورٹ شپ کی باتوں کے
 کچھ نہیں ہوتا۔ آپ کی طرح وہاں بھی بعض ناقصہ کار لوگ ہی اعتراض کرتے
 ہیں۔ مگر اُن میں زیادہ تر وہی لوگ ہیں جن کو ناولوں کے مقابل میں اپنے
 تصانیف کے ناکام رہنے پر غصہ آتا ہے۔ اصل یہ ہے کہ ہر چیز میں ترقی
 جب ہی ہوتی ہے جب کثرت ہوتی ہے۔ جس طرح انگلستان میں ہزار ہا ناول
 نویسون ہیں سے چند اعلیٰ درجے کے دانش پر داز اور نازک خیال ہیں اُسی طرح
 ہمارے یہاں بھی جب ہزاروں لکھنے والے ہوں گے تو دو چار ایسے اعلیٰ
 درجے کے جادو نگار ہوں گے جن پر ہندوستانی لٹریچر کو ناز ہوگا۔ اسکی اُمید
 ہی نہ رکھنا چاہیے کہ کسی فن کے صرف دو چار جاننے والے پیدا ہوں گے
 اور پھر اُن میں کمال بھی ہوگا۔ اُردو شاعری کو لیجیے۔ جس وقت سے اُردو
 میں شاعری کا چرچا شروع ہوا ہے اس وقت سے اس وقت تک جتنے
 شعرا پیدا ہوئے اور جتنے اس وقت موجود ہیں اُن کا شمار سوا صدائے
 کوئی نہیں جانتا۔ مگر اس کثرت ہی کی برکت ہے کہ تیر و سودا، آس و آتش،
 ذوق و غالب، دبیر و آئیں اور امیر و داغ پیدا ہوئے۔ اگر شاعروں کی
 یہ کثرت نہ ہوتی تو یہ بالکمال اساتذہ ہرگز نہ پیدا ہوتے۔ اسی طرح اگر
 ناول نویسی کی طرف ہی رجحان رہا۔ ملک میں اسی طرح کا عام ذوق و شوق
 رہا تو جب ہزاروں ناول اور ڈراما کے مصنف پیدا ہو لیں گے تو ہندوستان
 بھی شک پیر، اسکاٹ، اور ڈکنس پیدا کرنے لگے گا۔ ہاں اگر آپ اس
 سلسلے ہی کو روک دین گے تو ایک شخص بھی کمال کا درجہ نہ حاصل کر سکے گا۔
 لہذا جو لوگ موجودہ ناولوں کی مخالفت کرتے ہیں وہ حقیقت میں ملکی لٹریچر

کے دشمن ہیں اور ہماری انشا پر داندی کو نقصان پہنچانا چاہتے ہیں۔ برے اور بے مزہ ناولوں کا فیصلہ کرنے والے ہم آپ نہیں ہیں۔ بلکہ اعلیٰ فیصلہ کرنے والی پبلک ہے۔ جو خراب اور ناپسندیدہ ہون کے وہ خود ہی مرٹ جائیں گے۔

ہندوستانی اور کشمیری ورین کو سب سے زیادہ ہمارا یہ جملہ ناگوار گذرا کہ ”ایک صاحب نیڈٹ رتن ناتھ سرشار کی عبارت کے دلدادہ ہیں تو وہ حالی اور آزاد سب کو اُنکے اوپر قربان کیے دیتے ہیں۔“ کہا جاتا ہے کہ آزاد کو کو اُنکے برابر کا تسلیم کیا گیا۔ اور یہ نہیں خیال کیا جاتا کہ سرشار اور آزاد کا مقابلہ کرنا ہی آزاد کے لٹریچر کا خون کرنا ہے۔ اپنے بھٹے کی ہر شخص تعریف کیا کرتا ہے۔ اور کشمیریوں کو حق ہے کہ سرشار پر ناز کریں۔ اسی خیال سے مشرعلیت کی تحریک کو سب نے خموشی سے طال دیا۔ ورنہ اردو کے تمام مستند اساتذہ جانتے ہیں کہ اردو لٹریچر پر اس سے بڑا کوئی ظلم نہیں ہو سکتا کہ آزاد کے ایسے عالی مرتبہ استاد کا نام سرشار کے مقابلے میں لیا جائے۔

ہندوستانی کا ایک خیال یہ بھی ہے کہ ہمارے ناول مرٹ گئے۔ اور اُن کی طرف پبلک کی توجہ باقی نہیں رہی۔ اور اس کی دلیل پیش کی ہے کہ وہ چار چار آئے پر پبلک رہے ہیں۔ شاید اس سے زیادہ معقول دلیل ہمارے دوست کو کبھی اس سے پیشتر نہ سوچھی ہوگی۔ ان ناولوں کا باوجود روک تھام کے بیسیوں مطالع میں چھپ جاتا۔ اور سارے ہندوستان کے کتب فروشوں میں پھیل جاتا۔ اور جو قیمت اصل میں قائم کی گئی تھی اُس کا اخیار سے باہر ہو جاتا اُن کی مقبولیت کی دلیل ہے یا مرٹ جانے کی؟ میں تو سمجھتا ہوں کہ ان ناولوں کو جیسی عام مقبولیت حاصل ہو گئی ہو ویسی آج تک کسی اردو کتاب کو نہیں حاصل ہوئی۔ نہ گورنمنٹ سے ملتی اشاعت میں کسی قسم کی مدد ملی گئی ہے۔ نہ سررشتہ تعلیم سے کوئی اعانت ملی ہے۔ نہ اُنکے لیے کانگرس۔ کانفرنس یا قومی ورملکی سوسائٹیوں سے مدد ملی گئی ہے۔

پھر بھی محض پیابک کی توجہ سے انکے بیسیوں ایڈیشنوں کا چھپ جانا ایک ایسی کامیابی ہے جس کو کبھی زوال ہو سکتا ہی نہیں۔ رہی یہ بات کہ یہ اتحاد کی ایسی کے خلاف ہیں۔ اتحاد ہندو مسلمانوں میں اتفاق کرانے کی کوشش کرتا ہے۔ ان ناولوں کو زیادہ تعلق یورپ کے عیسائیوں سے ہے۔ اُن سے اتفاق کرنے کا ہم نے بیڑا نہیں اٹھایا ہے۔ اس کام کو بہتر ہو کہ ہمارے دوست کانگرس کی پالیسی میں تھوڑی بہت ترمیم کر کے پورا کریں۔ صرف ہماری ایک کتاب منصوبہ موبنا ایسی ہے جو ہندوؤں کو ناگوار ہوئی۔ مگر اُسکے لکھتے وقت اس نتیجہ کی طرف ہمارا خیال نہیں گیا تھا۔

چیمپ کاٹیکا اور لیڈی ٹامیگو

کتنی بڑی حیرت کی بات ہے کہ چیمپ کاٹیکا جو آج دنیا میں خدا کی ایک بڑی بھاری برکت ہے اور جس کے رواج دینے پر یورپ جس قدر فخر و ناز کرے سچا ہے۔ دراصل ایک مشرقی علاج ہے۔ اور غالباً مسلمانوں ہی سے لیا گیا ہے۔

ہم ہندوستان میں دیکھتے ہیں کہ کامیابی کے اتنے تجربوں کے بعد بھی اب تک یہ حال ہے کہ ٹیکا لگائے جانے کے خوف سے امین بچوں کو چھپاتی پھرتی ہیں۔ پُرانے مذاق کے باب بھائی سخمے بچوں کے لیے ٹیکا لگاتے والوں سے گفتگو کرتے یا انھیں رشوت دینے کو تیار ہو جاتے ہیں۔ بڑے ہندو لوگوں تک کا یہ حال ہے کہ دفع الوقتی کے لیے جھوٹ فقرے بناتے ہیں اور بہت سے ملکی حکیم اور وید بھی باوجود عقل رکھنے کے اپنی طرف سے تصنیف کر کر کے ٹیکے کے رواج دینے پر مختلف اور طرح طرح کے اعتراضات کرتے ہیں۔ اور یہ نہیں پسند کرتے کہ اس لاکھوں دفعہ کے آزمائے ہوئے علاج سے فائدہ اٹھایا جائے۔ اُن کی اس نفرت و مخالفت کو دیکھ کے جب ہم اس کا خیال کرتے ہیں کہ یہ طریقہ علاج انھیں کے بیان سے

سیکھا گیا ہے تو بڑی حیرت معلوم ہوتی ہے۔ اور تعجب آتا ہے کہ اپنی ہی چیز
غیر یون کے ہاتھ سے لے تو وہ کس قدر اجنبی اور عجیب بن جاتی ہے؟
ٹپکے کو سب سے پہلے انگلستان کی ایک تعلیم یافتہ شریف زادہ اور
ہندوبہ وانا خاتون نے رواج دیا جس کا نام لیڈی ہانگولیری ورٹلی تھا۔
وہ ۱۹۱۶ء (۱۳۳۶ھ) میں انگلستان کے علاقہ نوٹنگھم شائر میں پیدا
ہوئی تھی۔ اعلیٰ درجے کے امیر اور شریف گھرانے کی بیٹی تھی۔ اس لیے اچھی
صحت میں نشوونما ہوا۔ اُس کا باپ ڈیوک آف گلسٹن روشن خیال اور
انگلستان میں تھا جس نے بیٹی کو اچھی سے اچھی تعلیم دلائی۔ اور بیٹی کو بھی علم
و فضل کا ایسا شوق تھا کہ لاطینی زبان میں بہت اچھا اور خور حاصل کر لیا اور
بڑی نمایاں ترقی کی۔

بائیس برس کے سن کو پونجی تو انگلستان کے ایک نامی گھرانے کے
اقبال مندوجوان ایڈورڈ ورٹلی ہانگولیری کے ساتھ شادی ہو گئی۔ جو پہلے اول
آف سینڈویچ کا فرزند تھا۔ سٹر ہانگولیری پارلیمنٹ میں جھکا اور تھوڑا حاصل
کرنا شروع کیا۔ چند ہی روز میں وہ بڑا قابل اور روشن خیال میر ثابت ہوا
شہور شاعر ایڈلین سے اُس سے بڑی دوستی تھی۔ اور انگلستان کے اعلیٰ
درجے کے مہربان سلطنت میں شمار کیا جاتا تھا۔

۱۳۳۷ھ (۱۹۱۶ء) میں سٹر ہانگولیری قسطنطنیہ کے سفیر مقرر ہوئے
دولت عثمانیہ کے دار السلطنت کو روانہ ہوئے اور لیڈی میری ہانگولیری
بھی جن کی عمر اب ۲۶ برس کی تھی چارے شہر کے ساتھ استقبال کی راہ
لی۔ جہاں دونوں میان بوی کو دو سال تک رہنا پڑا۔

قسطنطنیہ میں انگلستان کے بہت سے سفیر اس سے پہلے بھی آچکے
ہوں گے مگر سٹر ہانگولیری نے محض اپنی بوی کی قابلیت سے جو ناموری و شہرت
حاصل کی اس سے پہلے کسی کو نہیں نصیب ہوئی تھی۔ لیڈی میری بہان
ترکی امرا کے خاندانوں سے ملین۔ اُنکے حالات دریافت کیے۔ اور جو کچھ
واقعات معلوم ہوتے انھیں لکھ لکھ کے لندن میں اپنے دوستوں کو بھیجا کرتی۔

یہ خطوط اس قدر دلچسپ تھے کہ لوگوں نے شوق اور قدر سے جمع کیے۔ اور ہر طرف لوگوں میں اُنکے پڑھنے کا اشتیاق پیدا ہوا۔

قیام قسطنطنیہ کے زمانے ہی میں لیڈی میری مائیگو کو پتہ لگا کہ یہاں کے بعض گانوں میں چپک کے روکنے کے لیے بعض مائیں اپنے بچوں کے ٹیکا لگایا کرتی ہیں۔ اس نئے اور عجیب علاج کو اُنھوں نے اُن گانوں میں جانے دریافت کیا۔ جو عورتیں اس کا طریقہ جانتی تھیں اُن سے مل کے کیفیت دریافت کی۔ اُن لڑکوں کو دکھایا جن کے ٹیکا لگایا گیا تھا۔ خوب اچھی طرح آزمائے کے بعد خود اپنے فرزند کے ٹیکا لگایا۔ اور دیکھا کہ وہ چپک سے بالکل محفوظ رہا۔ تب اُنھوں نے آزمائش کے لیے اور بہت سے لڑکوں کے ٹیکا لگایا۔ اور پھر اُسے عام لوگوں میں پھیلائے لیکن جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مشرقی یورپ میں اُن کی کوشش سے ٹیکے کا رواج ہو گیا۔ اور لوگ اس علمی علاج کی قدر کرنے لگے۔

۱۷۷۷ء محمدی (۱۷۷۷ء) میں لیڈی میری اپنے شوہر کے ساتھ انگلستان واپس آئیں اور مقام ٹونی کٹھم میں بود و باش اختیار کی۔ اب یہاں اُن سے انگریزی کے مشہور شاعر پوپ سے بہت راہ ورسم ہو گیا تھا۔ اور گوکہ وہ اپنے دلچسپی کے اوقات پوپ کی صحبت میں بسر کرتی تھیں مگر یہاں بھی اُنھیں شب و روز ٹیکے کے رواج دینے ہی کی فکر رہا کرتی تھی۔ اس کے بعد خدا جانے کیا بات ہوئی کہ پوپ سے بگڑ گئی۔ اور پوپ نے باوجود ایک بلند خیال اور عالی دماغ شاعر ہونے کے جذبے میں اُنکے لیڈی میری کی بھوس میں چند شعر کہ ڈالے جن میں اُنکے اخلاق پر حملہ کیا اور چاہا کہ لیڈی میری کی مسئلہ ناموری۔ قابلیت۔ پاکیزگی خیال اور تنک نفسی کی شہرت کو خاک میں ملا دیں۔ مگر چونکہ اخلاقی جرأت نہ تھی اور پوپ کے دل میں خود ہی چور تھا اس لیے اُن اشار کو گناہم طور پر شائع کیا۔ اگر کسی نے پوچھا بھی کہ یہ آپ کے شعر ہیں تو انکار کر دیا۔ لیکن ایسی باتیں نہیں چھپائے تھیں؟ ہر جگہ شہرت ہو گئی کہ یہ شعر اصل میں پوپ ہی کے ہیں مگر چونکہ بے اصل و

حقیقت ہیں اس لیے وہ اپنی طرف منسوب کرتے دڑتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ سچا اسکے کہ لیڈی میری کے نام پر کسی قسم کا حرف آنے خود پوپ کو سخت بڑبائی نصیب ہوئی۔ عام لوگوں نے اُن کی اس حرکت کو ناپسند کیا۔ اور اُن نے انہیں کو ذلیل و کمینہ سمجھنے لگے۔

اب ۱۸۳۹ء (۱۲۵۹ھ) شروع ہوا۔ اور لیڈی میری کا سن ۲۹ سال کا تھا۔ طبیعت ناساز رہنے لگی۔ اور معلوم ہوا کہ انگلستان کی آب و ہوا موافق نہیں ہے۔ تبدیل آب و ہوا کے لیے ایتالیا کے سفر کیا۔ وہاں شہر ونیس میں جا کے اقامت گزین ہوئیں۔ اور صحت پر قرار رکھنے کے لیے اس طرح پانچ توڑ کے بیٹھیں کہ ۲۲ سال وہیں گزر گئے ۱۸۶۱ء لیڈی میری میں گئی تھیں اور ۱۸۹۰ء لیڈی میری ۷۱ برس کی بوڑھی اور واجب التقسیم خاتون بن کے پھر انگلستان میں آئیں۔ اس لیے کہ اُنکی صاحبزادی لیڈی ہوٹ نے تاکید سے بلایا تھا۔ مگر عمر پوری ہو چکی تھی۔ تندرستی نے جواب دیدیا۔ اور وطن میں آ کے شاید پورے ایک برس بھی نہ رہی ہوں گی کہ ۱۸۹۱ء لیڈی میری (۷۱ سال) میں دنیا سے رخصت ہو گئیں۔ اور ناموری ویکوکاری کے رجسٹر میں اپنا نام لکھوا کے دوسرے عالم باقی میں جا پہنچیں۔

مگر دنیا میں اُن کی دو نہایت ہی قابل قدر یادگارین ہمیشہ باقی رہیں گی جن میں سے ایک بھی کسی کو حاصل ہو تو اُس کی ناموری و برکت کے ذمہ رکھنے کو کافی ہے۔ ایک تو جیک کا ٹیکا جس سے اب ساری دنیا نفع اٹھا رہی ہے، اور ہندوستان ہی نہیں دنیا کے ہر ملک کے گائون گائون میں لیڈی میری کی یہ یادگار اپنی برکتوں سے نوع انسان کو نفع پہنچا رہی ہے۔

اور دوسری یادگار اُنکے وہ خطوط ہیں جو اُنھوں نے قسطنطنیہ سے اپنے احباب کو لکھے تھے۔ انگلستان کے لوگوں میں اُنکے مطالعہ کا شوق اتنا بڑھا کہ اُنکی وفات کے دوسرے ہی سال یعنی ۱۸۹۱ء لیڈی میری وہ خطوط میں جلدوں میں مرتب و مدون ہو کے چھپے اور شائع ہوئے۔ چند روز بعد لوگوں کو کچھ اور خطوط ملے۔ اور چوتھی جلد بھی مرتب ہو کے شائع ہو گئی۔

ان خطوط کی زبان ایسی دلکش اور شیریں تھی کہ بہت ہی پسند کیے گئے۔ خصوصاً اس لیے کہ ترکوں کے قومی خصائص معلوم ہونے کا یورپ میں جس قدر شوق تھا اسی قدر حالات سے لاعلمی تھی۔ لیڈی میری سے پہلے کسی نے ایسی تفصیل و تحقیق سے آل عثمان کے حالات نہیں بتائے تھے۔ بلکہ کہا جاتا ہے کہ ترکوں کے حالات میں جو پہلی کتاب انگلستان میں شائع ہوئی یہی تھی۔

لوگوں نے اس کتاب کے لیے اس کثرت سے شوق کے ہاتھ پھیلائے کہ پہلا ایڈیشن چند ہی روز میں ختم ہو گیا۔ دوبارہ بھیجی اور تھوڑے زمانے میں فروخت ہو گئی۔ غرض برابر ایڈیشن پر ایڈیشن شائع ہوتے چلے جاتے تھے یہاں تک کہ ۱۷۳۲ء (۱۱۴۸ھ) میں یعنی لیڈی میری کی وفات کے ۴۱ برس بعد اُن کے صاحبزادے نے از سر نو درست اور مرتب کر کے اُن خطوط کی چاروں جلدوں اور اپنی ماں کی دیگر قابل قدر تصانیف کا ایک نیا اعلیٰ درجے کا ایڈیشن شائع کیا۔

لیڈی میری کے صاحبزادے ایڈورڈ ورٹلی ماسکو کی نسبت کہتے ہیں کہ دماغ بگڑا ہوا تھا۔ امارت اور گھمکی فارغ البالی پسند نہ تھی۔ جب دل میں آتی بھاگ کھڑے ہوتے۔ اور کسی ایسے کام کو اختیار کر لیتے جو اُن کی حالت و حیثیت سے بہت ہی گرا ہوتا۔ دوسرا کمال اُن میں یہ تھا کہ سچ سے نفرت تھی۔ اور غلط و بے بنیاد واقعات کو اس طرح شوکت الفاظ سے بیان کرتے اور ایسے لعلیے بانڈھ دیتے کہ سننے والے کو سچ کا یقین آ جاتا اس میں اس قدر ملکہ بڑھا ہوا تھا کہ فی البدیہہ قصے پر قصے دل سے بٹ کے بیان کرتے چلے جاتے اور کیا مجال کہ سلسلہ ٹوٹ جائے۔ مگر بعد اکتا قیامت تھا۔ پہلی بار بھاگے تو گھرواؤں کو ملنے سے پاس ہو گئی چند روز بعد پتہ لگا کہ

آپ ایک چینی سوئی پر کے نوکر ہیں۔ انگلستان کے ہر مکان بلکہ ہر کمرے میں آتش خانہ بنا ہوتا ہے۔ اُس میں سے دھواں نکلنے کے لیے جوئل دیوار کے اندر ہی اندر اوپر تک چلا جاتا ہے اُسے چینی کہتے ہیں۔ اس چینی میں دو چار بیسے میں اتنا کاہل جمع ہو جاتا ہے کہ نہ نکالا جائے تو راستہ بند ہو جائے۔

اس لیے وہاں بہت سے لوگ چینی سوئیری یعنی چمپین میں سے کاجل جھاڑنے کا کام کرتے ہیں۔ ان لوگوں کے کپڑوں میں چونکہ ہمیشہ کاجل بھرا ہوتا ہے اس لیے حد سے زیادہ بیٹے پھیلے رہتے ہیں۔ اور انگلستان میں جو شخص قبا زیادہ سیلا ہو اسی قدر زیادہ ذلیل و حقیر تصور کیا جاتا ہے۔ غرض چینی سوئیری سے زیادہ ذلیل اُس سرزمین میں کوئی نہیں ہوتا۔ مگر آپ کو چوش خاکساری میں ہی ہمیشہ سب سے زیادہ پسند آیا۔

لوگوں کو معلوم ہوا تو سمجھا سمجھا کے گھر میں لے آئے۔ لیکن چند روز بعد پھر روفیکو ہو گئے۔ اب کی خبر لگی کہ ایک مچھلی والے کے شاگرد ہیں۔ اور اس کے ساتھ کشتی میں بیٹھے مچھلیاں پکڑتے ہیں۔ لوگ گھیر گھار کے پھیر گئے۔ مگر تھوڑے زمانے کے بعد پھر حیرت ہو گئے۔ اب کی شاید ان کے مطلوبہ خطوط کا اثر تھا کہ قسطنطنیہ میں آ کے ترکوں کی طرح رہنے لگے۔ انھیں کی وضع اختیار کر لی۔ انھیں کے کپڑے علانیہ پھینا شروع کیے۔ انھیں کی سی ٹیٹی اور دستار سر پہنی۔ اور چونکہ ان کی پوری پوری معاشرت اختیار کر لی تھی۔ اس لیے پہن امید ہے کہ تثلیث سے توبہ کر کے مسلمان بھی ہو گئے ہوں گے۔ لہذا ہم اُن کے حق میں دعاے مغفرت کر کے سلسلہ بیان کو ختم کرتے ہیں۔

ایک کا رخیر

آنریبل رسلے ہادر باؤنگکا پرشاد ورمائے نشی سجا حسین صاحب کی معذوری کے زمانے میں اُن کی اعانت و مددگیری کا بیڑا اٹھایا ہے۔ وہ اس بات کے محرک ہیں کہ پلاک چندے سے اتنی رقم بیک میں جمع کر دی جائے جس سے نشی سجا حسین صاحب کو پچیس تیس روپیہ پوارہ بطور وظیفہ ملا کر نشی سجا حسین صاحب بیشک پلاک کی اعانت کے مستحق ہیں۔ اُن کی حالت غور سے دیکھیے تو عبرت روزگار ہے۔ انکی زندگی کا آغاز نزد الحمالی اور امیرانہ زندگی سے ہوا۔ تا زونم میں پرورش پائی۔ اور گوکہ آبائی جائداد

کو انھوں نے ۱۲ عاقبت اندیشی سے تلفت کر دیا مگر پھر بھی اس وقت تک اپنی
 لٹریچر قلمیت سے معزز زندگی بسر کرتے رہے۔ یورپ میں اس قسم کے لوگوں
 کی ایسی قدر دانی ہوتی ہے کہ وہ آخر تک اپنی زندگی اچھی طرح بنا ہے جاتے
 ہیں۔ مگر ہندوستان کی بیلک نے ابھی تک اس قسم کا کوئی کام نہیں کیا۔ باوجود
 گنگا پرشاد نے جس کام کی تحریک کی ہے وہ دراصل نیا ہے۔ مگر وہی اس کا رخیہ
 کے محرک ہو بھی سکتے تھے۔ منشی سجاد حسین صاحب ان لوگوں میں ہیں جنھوں
 نے اول سے آخر تک ان تمام مسائل میں جو ہندو مسلمانوں میں مختلف فیہ رہے
 ہمیشہ مسلمانوں سے اختلاف کیا۔ سرسید اور تمام مسلمان لیڈروں پر سب سے
 بڑے طعن و تشنیع کرنے والے وہی تھے۔ کانفرنس اور تمام اسلامی تحریکوں سے
 ہمیشہ اختلاف رہا اور کانگریس کے اول درجے کے طرفدار تھے۔ کچھ انھیں
 چٹروں پر منحصر نہیں ہے۔ عموماً جو باتیں مسلمانوں میں مقبول ہوئیں منشی سجاد حسین
 صاحب نے انھیں ہر ہمت سہام مزدربنایا۔ معاملات و رکنا راہی اس ہندو
 وہ ذاتیات پر حملہ کرنے میں بھی دریغ نہ کرتے تھے۔ نواب محسن الملک اور
 مولانا حالی کی ذات پر جیسے شرمناک حملے اودھ بیچنے کے لیے اُن کے بھی
 کوئی شریعت شخص خوش نہ ہو سکا۔ اس لحاظ سے یہ ہے کہ باوجود گنگا پرشاد ہی
 اس کا رخیہ کی تحریک کے لیے نہایت موزوں شخص تھے۔ مسلمانوں کا فرض ہے کہ
 اُن کا ہاتھ بٹائیں اور یقین جانیں کہ جس خاص مذاق کے مسلم القوت استاد
 منشی سجاد حسین تھے اب اس تہذیب کے دور میں جبکہ علم ہمت آگے بڑھ آیا ہے
 ہرگز نہ پیدا ہو سکیں گے۔ مگر ایسی قابلیت اور غور کے لوگوں کے لیے صرف
 پچیس تیس روپیہ وظیفہ بیلک سے مانگ کے دنیا دراصل ان کی قدر دانی تہین
 تزیل ہے۔ میرے نزدیک باوجود صاحب کو چاہیے کہ بیلک کو زیادہ فیاض
 بنائیں اور کم از کم ڈیڑھ سو روپیہ ماہوار وظیفہ دلوائیں تاکہ منشی صاحب
 شرفیاء زندگی بسر کر سکیں جس کے وہ عادی رہے ہیں۔ اگر زور سے تحریک
 کی گئی تو ڈیڑھ سو روپیہ ماہوار کا سرانجام ہونا چندان مشکل نہیں ہے۔

خوشی اور رنج کا انحصار طبیعت پر ہے

انسان کو ہمیشہ اپنی گزری ہوئی زندگی اور ابتدائے عمر کے واقعات یاد کر کے صدمہ ہوتا ہے اور وہ نہایت افسوس کے ساتھ یاد کرتا ہے کہ اب وہ دن بھر کبھی نہ نصیب ہونگے۔ ابتدائے عمر میں قدرت کی ہر شے سے دلچسپی اور خوشی حاصل ہوتی ہے۔ اور بے زبانی کہ اس وقت خوشی کی کوئی انتہا نہیں ہوتی۔ کیونکہ فکرین بہت کم بلکہ بالکل نہیں ہوتیں۔ یا ہوتی ہیں تو فقط عارضی۔ اور ساری دنیا میں جس چیز پر نظر پڑ جاتی ہے وہ ہماری خوشی اور فرحت کا باعث بن جاتی ہے۔ مگر افسوس کہ بعد کی عمر میں یہ حالت قائم نہیں رہ سکتی۔ جس قدر فکرین زیادہ ہو جائیں گی دنیا کی اور کسی چیز پر نظریں پڑیں گی۔ کیونکہ ہم انہیں فکر وں سے ہر وقت پریشان رہیں گے۔ اب ہم جس چیز کو دیکھتے ہیں اس نظر سے نہیں دیکھتے جس طرح پہلے دیکھا کرتے تھے۔ لہذا ویسی خوشی اور فرحت بھی حاصل نہیں ہوتی جیسی پہلے حاصل ہوا کرتی تھی۔ اس سے یہ معلوم ہوا کہ خوشی اور رنج دراصل کوئی چیز نہیں۔ دراصل ہماری طبیعت ہے جو ایک شے کو خوشی اور دوسری کو رنج بنا دیا کرتی ہے۔

اگر ہماری طبیعت خوش ہے تو ہر چیز سے جسے ہم دیکھتے ہیں ایک قسم کی فرحت اور دلچسپی پیدا ہوگی۔ لیکن اگر ہم پریشان ہیں تو کوئی دلچسپ ترین منظر بھی ہمیں خوش نہیں کر سکتا۔

یورپ میں دو سو سال قبل تک یہ عام رواج تھا کہ مجرم قیدی سلیمانین میں نہیں رکھے جاتے تھے بلکہ وہ زنجیروں میں باندھ کے کسی خاص مقام پر کام کرنے کے لیے بھیج دیے جاتے۔ اکثر قیدی جو ساری عمر کے لیے قید کیے جاتے انہیں جہازوں پر باندھ دیتے تاکہ وہ جہاز کی لمبائی چلائیں۔ وہ اسی جگہ پر دن رات بندھے رہتے اور جب ضرورت ہوتی لمبائی چلاتے۔ دوسرے لوگ انہیں کھانا پانی پہنچا دیا کرتے۔ اسی طرح ایک شخص ساری عمر کے لیے

ایک فرانسیسی جہاز پر باندھ دیا گیا۔ اُسے صبح سے شام تک محنت کرنی پڑی اور نہایت خراب قسم کا کھانا دیا جاتا۔ غرض اس دنیا میں اُسے کسی قسم کی امید نہ تھی۔ مگر حالت یہ تھی کہ وہ ہر وقت ہنساکرتا کبھی فکر نہ نظر آتا اور لوگوں سے جو اُس کے پاس بہتے مذاق کر کے دل ہلاتا۔ کبھی وہ گانا کبھی زنجیروں میں جکڑا ہوا نظر ہوتا اور ناچنے لگتا۔ غرض وہ کبھی رنج و افسوس کی کو اپنے پاس نہ آنے دیتا۔ بھلا یہ شخص جسکے لیے زندگی ایک عذاب تھی کیوں اس درجہ خوش تھا؟ اصل یہ ہے کہ اسنے اپنی طبیعت ہی کو ایسا بنالیا تھا کہ کوئی فکر اُس پر اثر نہ کرتی۔

اسی طرح ایک اور اس سے زیادہ دلچسپ واقعہ سنئے۔ اہل فرانس عیسوی عشرت کے ولدا وہ ہیں۔ اور اس میں وہ اب ساری دنیا میں مشہور ہیں۔ مگر اس کا ثبوت ذیل کے واقعہ سے زیادہ اور کسی طرح نہیں مل سکتا۔ گذشتہ عظیم الشان جنگ کے دوران میں بھی فرانس کے دار السلطنت پیرس کی دلچسپین میں بہت کم فرق آنے پایا۔ وہاں کے تھیسٹھیسٹر اتنے بڑے ہیں کہ ایک لاکھ آدمی ایک وقت میں تماشہ دیکھ سکتے ہیں۔ ایک تھیسٹر میں تیا تماشہ نہایت اہتمام سے کیا گیا تھا اور سارے تھیسٹر میں ایک کرسی بھی خالی نہ تھی۔ عین اُس وقت جبکہ تماشہ ہو رہا تھا جرمون نے اپنی لائک ریجن جن سے گوکہ باری کی اور ایک گوکہ شرک کے دوسری جانب عمارتوں پر گرا۔ تھیسٹر اور اُن عمارتوں کے درمیان صرف ایک شرک جائل تھی۔ لوگوں میں جو تماشہ دیکھ رہے تھے کسی قدر پریشانی پیدا ہوئی اور کچھ لوگ اُٹھنے کا ارادہ کرنے لگے۔ فوراً تھیسٹر کا مینیجر نمودار ہوا اور اُسے کہا کہ ہم اس وقت ایک نہایت دلچسپ سیر میں مشغول ہیں۔ باہر جا کے ہر قسم کی فکر دین میں مبتلا ہو جائیں گے۔ اگر چار آخری وقت آتی گیا جو تو اپنی آخری گھڑیاں طبیعت اور تکلیف میں کیوں بسر کریں ہی دلچسپ فرحت بخش سیر میں صرف کر دیں۔ اسکا یہ نتیجہ ہوا کہ ایک شخص بھی جگہ سے نہ ہلا اور تماشہ خیر و خوبی ختم ہو گیا۔ اہل یہ کہ کسی مصیبت اور پریشانی کے رونے کہنے کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ اسے دل سے چھلا دینے کی کوشش کریں۔ جب تک خیال چاہے دل میں قائم رہے کسی بات میں لطفت حاصل ہوگا۔ ہر وقت اُسی فکر میں مصروف رہنے کا سوا اسکے اور کوئی نتیجہ نہیں کہ خود کو پریشان کریں اور ایک دائمی رنج میں مبتلا رہیں۔ اس دنیا میں شاید ہی کوئی دن ایسا ہوگا جب ہمیں کئی قسم کا صدمہ یا رنج نہ حاصل ہو۔

یوڈوشس اور لیونٹائن

ایسین

یوڈوشس اور لیونٹائن دونہا بیت غریب لڑکے تھے لیکن دونوں سمجھدار اور نیک تھے۔ دونوں نے ساتھ ہی ساتھ تعلیم پائی اور آپس میں ایسی دوستی اور محبت ہو گئی کہ آخر عمر تک قائم رہی۔ یوڈوشس نے اسکول کی تعلیم ختم کر کے کسی سرکاری محکمہ میں نوکری کر لی اور اپنی اعلیٰ قابلیت کی بدولت درجہ بدرجہ ترقی کرتا رہا۔ یہاں تک کہ وہ بڑا مالدار ہو گیا۔ لیکن لیونٹائن نے اپنی زندگی سیر و سیاحت اور مختلف علوم کے حاصل کرنے میں صرف کی۔ اور چند روز میں اُسے ہر فن سے واقفیت ہو گئی۔ اور سارے ملک میں اُس کے علم و فضل کی شہرت تھی۔ اُس نے فقط اپنے ہی ملک میں سفر نہیں کیا بلکہ دور دراز کے ملک میں گیا اور بڑے بڑے بادشاہوں سے ملا تھا۔

اس سیر و سیاحت اور مختلف ملکوں کے لوگوں سے ملنے کی وجہ سے لیونٹائن اپنے زمانہ کا بڑا تجربہ کار عالم ہو گیا۔ اُس کا دوست یوڈوشس مال و دولت میں ترقی کرتا گیا۔ یہاں تک کہ جب دونوں کی عمر چالیس سال کے قریب ہو گئی تو انھوں نے ارادہ کیا کہ اب اپنی بقیہ زندگی دوستی و محبت کے آرام و آسائش میں بسر کر دیں۔

اس خیال کے پیدا ہوتے ہی دونوں اس بات پر آمادہ ہو گئے کہ شہروں کے شور و غل کو چھوڑ کے کہیں دیہات میں رہیں۔ دونوں نے اپنی شادیان کہیں اور یوڈوشس نے ایک بہت بڑا علاقہ خرید لیا۔ اور لیونٹائن نے بھی اپنے دوست کے قریب ہی ایک چھوٹی سی زمین مول لے لی۔ ان کی شادی کو ایک سال سے زیادہ زمانہ گزرا ہو گا کہ دونوں کے اولاد میں ہوئیں۔ یوڈوشس کے چار لڑکے پیدا ہوئے اور لیونٹائن کے چار لڑکی۔ مگر اسکے ساتھ ہی لیونٹائن کی بیوی نے بھی سفر آخرت کیا۔

ایک دن دونوں اسی غم میں بیٹھے باتیں کر رہے تھے کہ لیونٹائن نے کہا
 ”بیکس عورت کے لڑکی کی تعلیم و تربیت غیر ممکن ہے۔ یہ کہہ کے وہ اپنی قسمت پر
 افسوس کرنے لگا۔ یوڈوشس ایک دوسرے خیال میں مصروف تھا۔ اُسکے
 دل میں یہ خیال پیدا ہوا کہ جب لڑکوں کو یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ ہم کسی بڑی
 جائیداد کے مالک ہوں گے تو ان کی تعلیم بہت زیادہ مشکل ہوتی ہے۔ غرض کہ
 دونوں میں کچھ ایسی باتیں ہوئیں کہ اسی محبت میں طے ہو گیا کہ دونوں اپنے
 اپنے بچوں کو بدل لیں۔ لیونٹائن لڑکے کی تعلیم و تربیت اپنے ذمے لے اور
 لڑکی یوڈوشس اور اُس کی بیوی کے پاس پرورش پائے اور بیس سال کی
 عمر تک یہ راز ان بچوں پر بھی نہ ظاہر ہونے پائے۔ یوڈوشس کی بیوی نے بھی
 اس تجویز کو پسند کر لیا کیونکہ وہ سمجھا عورت بھی اور اُس نے دیکھا کہ اس
 طریقے سے میرے بیٹے کی بہترین تعلیم ہو جائے گی اور پھر وہ میری نظروں کے
 سامنے بھی رہے گا۔ لہذا لیونٹائن کی لڑکی لیونلا کو اپنے پاس رکھ لیا۔ اور
 اپنے بیٹے فلوریو کو لیونٹائن کے حوالہ کر دیا۔ اور دونوں بچے ایسی توجہ اور
 محبت میں پرورش پائے کہ یہ بالکل نہ معلوم ہوتا کہ پرورش کرنے والے
 اُن کے حقیقی والدین نہیں ہیں۔

دونوں بڑے ہوئے اور سن تیز کو پہنچے۔ فلوریو نے اپنی حالت پر غور
 کیا تو اُسے نظر آیا کہ اپنی محنت کے سوا اور کوئی ذریعہ زندگی بسر کرنے کا
 نہیں ہے۔ روزانہ بھی خیال اُس کے دل میں پختہ ہوتا گیا۔ اور اس کا ایسا
 اچھا اثر پڑا کہ لیونٹائن اُسے جس طرف لگا دیتا وہ بڑی محنت سے اُسے حاصل
 کرتا۔ دراصل وہ بڑا تہذیبی واقع ہوا تھا اور لیونٹائن کی اعلیٰ تعلیم نے اُسے
 بہت جلد ترقی کرنے کا موقع دیا۔ ابھی اُس کی عمر پورے بیس سال کی نہ تھی
 کہ اُس نے بہت سے علوم حاصل کیے اور مردانگی کے کھیل تماشوں میں بھی
 بڑی شہرت حاصل کی

فلوریو اکثر یوڈوشس کے مکان پر آتا۔ اور بچپن کے اُنس نے اُس کے
 دل میں لیونلا کے ساتھ محبت کی شمع روشن کر دی جو اندر ہی اندر روشن ہو کے

عشق کے درجے کو پہنچ گئی۔ لیکن اپنے عشق کا حال وہ کسی پر ظاہر نہ کر سکا کیونکہ بظاہر اُسے نظر آتا تھا کہ اتنی دو ٹوند اور صاحب جائداد لڑکی سے کیونکر شادی کر سکون گا۔ کیونکہ نہایت حسین شہرلی لڑکی تھی۔ وہ بھی دل ہی دل میں فلوریو کے ساتھ محبت کرتی۔ لیکن کسی کو معلوم نہ ہو سکا۔

فلوریو اپنی ترقی تعلیم میں مصروف تھا۔ کیونکہ اُسے فقط یہی ایک ذریعہ ایسا نظر آیا جس سے دولت پیدا کر کے کیونلا سے بھی شادی کی درخواست کی جاسکتی ہے۔ اب اُس کی عمر بیس سال کے قریب پہنچ گئی تھی۔ اور وہ اپنے مکان سے دور کسی شہر میں تھا۔ دفعۃً کیونٹائن نے اُسے اپنے پاس بلا بھیجا۔ فلوریو کیونٹائن کے پاس پہنچا اور اُسی وقت کیونٹائن نے اُس سے کہا ”میرے دوست یوڈوسس کو تم سے کچھ ضروری باتیں کرنی ہیں لہذا تم جا کے اُن سے مل آؤ۔“ یہ کہتے ہی وہ اٹھ کے فلوریو سے ملا اور آہستہ آہستہ ہو کے اُسے رخصت کر دیا۔

فلوریو یوڈوسس کے مکان پر پہنچا۔ وہ اس کا منتظر ہی تھا۔ بڑی خاطر سے بٹھایا اور تھوڑی دیر کے بعد اطمینان سے اُس سے اُس کے نسب اور تعلیم و تربیت کا حال بیان کر دیا۔ پھر آخر میں کہا ”در اصل کیونٹائن کی اس محنت اور مشقت کا شکریہ جو انھوں نے تمھاری تعلیم میں اٹھائی میرے مکان سے باہر ہے۔ لیکن اس کا کچھ معاوضہ اگر ہو سکتا ہے تو یہی کہ اُن کی بیٹی کے ساتھ تمھاری شادی کر دی جائے۔ اس طرح یہ حال معلوم ہو جائے کہ بعد تم کیونٹائن کے عزیز ہو گے اور انھیں جو صدمہ تمھارے علیحدہ کرنے کا ہوا ہو گا کم ہو جائے گا۔ اور کیونلا بھی اس کے بعد میری بیٹی اور میرے ہی ہاں بیٹھیں اگرچہ وہ یہ نہیں جانتی کہ میں دراصل اُس کا باپ نہیں ہوں لیکن اسے میرے ساتھ بڑی محبت ہے۔ اور اس محبت کا یہی سلسلہ ہے کہ اُس کی شادی تمھارے ساتھ کر دی جائے۔ تم میری جائداد کے مالک ہو اور اب اپنی تعلیم و تربیت کی وجہ سے اُسے ترقی دے سکو گے۔ لیکن اگر تمھیں پہلے سے معلوم ہو جاتا کہ اتنی بڑی جائداد تمھارے قبضہ میں جانے لے تو حصول علم میں ہرگز اتنی محنت

نہ کرتے اور اس کا نتیجہ یہ ہوتا کہ یہ جائدا وضائع ہوتی اور تم اُس سے بخوبی
خامدہ نہ اٹھا سکتے۔ چاہے دوسرے کمرے میں تھا رہی مان تھا داد انتظار
کر رہی ہیں اور تم سے ملنے کی محجہ سے زیادہ مشتاق ہیں اور جس وقت
میں نے یہ واقعات تم سے بیان کیے ہیں اُسی وقت اُنھوں نے یہ باتیں
لیونلا سے کہہ دی ہوں گی۔

فلوریو کو یہ واقعات معلوم کر کے ایسی خوشی ہوئی کہ اُس کی زبان سے
کوئی لفظ نہ نکل سکا۔ وہ تھوڑی دیر تک خاموشی کے ساتھ اپنے باپ کی طرف
دیکھتا رہا۔ پھر اٹھ کے اُن کے قدموں پر گر پڑا۔ کیونکہ سب سے زیادہ جس
بات کی اُسے خوشی ہوئی وہ اُس کی جائدا کی یہ تھی بلکہ وہ لیونلا کی تھی۔
لیونلا نے بھی اس تجویز کو پسند کیا اور اُس کے دو ہی چار روز بعد فلوریو
اور لیونلا کی شادی ہو گئی۔ اور اُن کی بقیہ عمر اطمینان اور آرام میں
 بسر ہوئی۔

چند مختصر خیالات

بعض مذہب والوں نے مولانا شبلی پر بدعتیہ کی کا الزام عائد کیا ہے۔
ہمیں بھی مولانا سے بعض عقائد میں اختلاف ہے۔ لیکن اس کے ساتھ یہ بھی کہتے ہیں کہ
یہی کا فر ہے سلمان سچا

سچ یہ ہے کہ یہی باتیں مولانا کے کلمات کا جوہر ہیں۔ قطع نظر تخریبی نظری
اور علم و فضل کے مولانا کا سائینا نفس اور انکی سی بے طبعی موجودہ علماء
است میں سدوم ہے۔ سچ یہ ہے کہ مذہب اُسی وقت تک ہے جب تک اُس
میں مولانا شبلی ہیں۔ اور جس دن شبلی نہ ہوں گے اُس روز مذہب بھی نہ ہوگا۔

مذہب عبارت ہے مجمع علماء سے۔ اور علماء میں تن پروری اور خود غرضی
کا مرض اس قدر بڑھ گیا ہے کہ اس محترم گروہ کا اصلی شمار یہ ہو گیا ہے کہ

”اپنی دنیا بنائیں اور دوسروں کی عقیبتی“ مذودہ اگرچہ عقیبتی درست کرنے کے لیے ہے مگر ہے ایک دنیوی چیز۔ لہذا ایسے لوگوں سے وہ کیوں کر مل سکتا ہے جو اپنے سوا دوسروں کی دنیا بنانا جانتے ہی نہیں۔ گو طبقہ علماء ہی میں سے جب ایک ایسا شخص مل گیا ہے جو اپنے اثبات نفس سے اور دین کی دنیا بھی سدھار سکتا ہے تو خدا کے لیے اُسے رہنے دو۔ ورنہ یہ سارا کیا دھرا خاک میں مل جائے گا اور مذودہ مولویوں اور پیر نادوں کی ایک جاگیر بن جائے گا جسکے نوٹے ہر جگہ کثرت سے نظر آ رہے ہیں۔

ش۔ ن۔ کی گنام تحریر پر بڑے بڑے لوگوں نے توجہ کی۔ مولانا شبلی کو اپنی براءت الگ کرنی پڑی۔ اور مولوی منزل اللہ خان صاحب شہادت دینے کو کھڑے ہو گئے۔ جس کے معنی یہ ہوئے کہ سید صاحب جو کچھ کہا کرتے تھے صحیح تھیہ کہا کرتے تھے اور خود مقرر تھے کہ اُن کے عقائد اور اُن کے الفاظ میں اختلاف ہے۔ میں تو سمجھتا ہوں کہ سید صاحب آدمی با مذاق تھے یہ بزرگ اُن کے سر ہو گئے ہوں گے۔ اُنھوں نے سمجھایا ہوگا اور یہ سمجھے نہ ہوئے تب اُنھوں نے ان کو بتانا شروع کر دیا۔ اور یہ بن گئے۔ جس کا نمونہ ہی تحریر ہے جسے یہ آج پیش فرما رہے ہیں۔ ان بزرگ سے کوئی پوچھے کہ جن چیزوں کا اقرار نامہ آپ کو سید صاحب نے لکھ دیا اُن سے اُن کو یا کسی کو انکار ہی کب تھا؟ یا اب کسے انکار ہے؟ جو کچھ لکھا ہے اُن کے مفہوم و مصداق میں ہے ورنہ ظاہری الفاظ کے تسلیم کرنے میں کسی کو نہ پہلے عذر تھا اور نہ اب ہے۔

جو حضرات ”تبنا کو تکتبا کو“ لکھنے پر زور دیتے ہیں اُن کے متعلق میرا کہ حسین صاحب نے اپنے ایک پریٹ خط میں یہ بڑے پر لطف ریمارک فرمائے ہیں کہ ”یہ طوفان بدتمیزی ہمارے آپ کے روکے رکھے کا نہیں تبنا کو کا تو کچھ جواب ہو بھی سکتا ہے قسم قسم (قصہ مصمم) انتہات (انخطاط) کا کیا جواب ہے؟ میں آپ کو خط دکھاؤں گا جس میں یہ الما ہے ”پوچھنا“ بمعنی پرسیدن۔

”سیکڑوں“ کی جگہ ”سینکڑوں“۔ جو لوگ تبا کو لکھتے ہیں وہ حضرات شنبہ کو شنبہ لکھنے پر کہیں نہیں آمادہ ہوتے؟ ان پچیس تیس سال میں ہی میل دنا میں تو بدترین (بد الدین) اور بدی الدین (میرج الدین) دیکھ لیجیے گا۔

ہندوؤں اور مسلمانوں کے تعلقات کا نازک ہونا خوب گل کھلا رہا ہے۔ اُدھر ہندوؤں نے مردم شماری میں گنوا ری اور دیہاتی زبان کو ہندی قرار دے کے کوشش شروع کی کہ ہندی بولنے والوں کی کثرت ثابت کریں اور اُردو زبان کو (جس کی نسبت اُنھیں عجیب و غریب ہو گیا ہے کہ مسلمانوں کی زبان ہے گو اُسے وہ خود بھی بولتے ہیں) زک دین۔ اُدھر آل انڈیا مسلم لیگ نے گورنمنٹ کو اس جانب توجہ دلائی کہ ادنیٰ اور شور قوموں کو ہندوؤں کے زمرے میں شامل نہ کیا جائے کیونکہ یہ لوگ آریں نہیں ہیں۔ اور اُنکے دیوتا بھی دوسرے ہیں۔ ہندو اُنھیں اپنا شریک کر کے اپنی کثرت ثابت کرنے کا ناجائز فائدہ اٹھاتے ہیں۔ چاہے ہمارے نوکل جمعیٹ و کمیٹ خفا ہو جائیں مگر بات معقول ہے۔

اس قسم کے اختلافات سے خیر اور کوئی فائدہ ہو یا نہ ہو مگر معاملات کی تحقیق تو خوب ہو جاتی ہے۔ واقعی شور قوموں کو ہندوؤں کے زمرے میں درج کرنا ہندوؤں کی توہین ہے۔ کیونکہ وہ صرف مسلمانوں کے مقابلہ میں اپنے آپ کو ہندو (یعنی ہندی) کہنے لگے۔ دراصل نہ اُنھیں کبھی ہندوؤں نے ہندو مانا تھا اور نہ وہ خود اپنے آپ کو ہندو خیال کرتے تھے۔ اگر اتنی ہی بنیاد پر وہ ہندو مانے جاتے ہیں کہ ان پر ہندوؤں کا اثر پڑا ہوا ہے تو پھر سکھوں۔ جہت ہیون۔ کیرنیتھیون اور اسی طرح کے صد ہا گروہوں کو مسلمان لکھا جانا چاہیے جو مسلمانوں کے اثر سے ہندوستان میں پیدا ہوئے ہیں۔

اگر گورنمنٹ نے لیگ کے کہنے پر ابھی عمل نہیں کیا ہے تو آئندہ کر لی۔ اُسے اپنی کوشش سے دست بردار نہ ہونا چاہیے۔ جب یہ سچ ہے کہ ادنیٰ قوم والے

آرین نہیں ہیں تو پھر کوئی وجہ نہیں کہ گورنمنٹ ہندوؤں کے پولیٹیکل مصالح کے لحاظ سے اُن کو خواہ مخواہ ہندو بنا دے۔ ایسے غریبوں تو بڑی حیثیت رکھنے والوں اور ہر سبز دربار سے نکالے ہوؤں کے لیے سرفِ اسلام اپنا آغوش نہیں کھولے ہوئے ہے۔ اور ایک کلمہ توحید کے انہار کے ساتھ ہی آنکھوں پر پٹھانے کو تیار ہے۔

مگر افسوس کہ ہندوستان کے خود پرست مسلمانوں نے ہندوؤں سے مانگی ہوئی شرافت پر نازان ہو کے اپنے آپ کو ہندو بنا لیا۔ اب بھی وہ آدیہ ورت والوں کی طرح کسی کو اپنے برابر نہیں سمجھتے۔ خیر شرافت تو مل گئی۔ گو وہ کرایہ کی ہو۔ اگرچہ پور اسلام خفست ہو گیا۔

مسلمانوں کو اُن کے اس مرض کی جانب ہم نے اگست کے دہلازمین توجہ دلائی تھی۔ جسے پڑھ کے اور کسی کے کان پر تو جوں بھی نہ رہیگی۔ مگر ایڈیٹر صاحب اخبار فورڈ (دیان) بڑے زور و شور سے ہماری تائید پر آمادہ ہو گئے۔ انھوں نے مسلمانوں کے اس مشرکانہ بخت کے دو ایسے عبرت ناک نمونے دکھائے جنھیں پڑھ کے شرم آتی ہے۔ وقت آگیا ہے کہ اب اس کی طرف عملی توجہ کی جائے۔

ہمارے دوست کورٹ اسپیکر صاحب کے بُلڈاگ

ہمارے دوست منشی محمد عبدالعزیز صاحب سابق کورٹ اسپیکر لکھنؤ اگرچہ بفضلہ تعالیٰ زندہ و سلامت ہیں۔ مگر وہ نہیں رہے جو تھے۔ صورت وہی ہے۔ آواز وہی ہے۔ باتیں وہی ہیں۔ مگر مزاج اور خیالات میں زمین و آسمان کا فرق ہو گیا۔ خلاصہ یہ کہ وہ پُرانے دوست عبدالعزیز ہی نہیں باقی رہے۔ مگر اُن کے دوستی کے کتون نے کچھ ایسی عمر ابد اور لازوال ہستی پائی ہے کہ اُن کی وضع

نہیں بدلتی نہ اُن کی صورت و حالت میں کوئی فرق آنے پایا ہے اور نہ اُن کے انداز و عمر میں کوئی تغیر نمودار ہوا۔ لندن کے تصویر دار رسالہ "اسک" میں نسبت تک ایک دلچسپ سلسلہ "ایز مین ایز ڈاگ" یعنی جیسے میان ویسا کتا، مدتوں جاری رہا۔ جس میں عجیب عجیب عنوانوں سے دکھایا جاتا کہ کتا ویسا ہی ہے جیسے اُس کے میان ہیں۔ بخلاف اس کے یہاں کتے کو میان سے کوئی نسبت نہیں ہے۔

ہمارے دوست منشی عبدالعزیز صاحب بڑے قابل، ذہین، طباع، زندہ دل، یار باش اور نہایت ہی خوش مذاق واقع ہوئے ہیں تیس سال کا زمانہ ہوا کہ ایک خاص موقع پر کانپور میں اُن سے ملاقات ہو گئی۔ اور انھیں باوجود پولیس کی ملازمت کے ادبی مذاق اور انتشار پردازی کے مشغلے میں مصروف دیکھ کے ہم نہایت ہی محظوظ ہوئے۔ ہم مذاقی عجیب چربے اور دنیا میں سب سے بڑی نعمت الٰہی یہی ہے۔ پہلی صحبت میں اُن سے اس قدر اُنس ہو گیا کہ ایک گھڑی پھر کا ملتا مدتوں کے لیے پر لطف یادداشتوں کا ایک بڑا بھاری ذخیرہ داغ میں جمع کر دیا کرتا۔ مگر افسوس یوں ل کے جو چھوٹے تو مدتوں صورت نہ دکھائی دی۔ اور وہی ہوا جو کسی شاعر نے کہا ہے کہ صبح

او بصر رفت و ما در کوہ بار سوا شدیم

اس عہد فراق میں ہم تو عالم خیالی میں بارہا اُن سے ملے۔ مگر نہیں معلوم اُن ملاقاتوں کی اُمین بھی خبر ہوئی یا نہیں۔ ایک مدت کے بعد اُن کے ادبی مذاق کا یہ نمونہ نظر آیا کہ "اخلاق عزیزی" نام ایک نہایت ہی اعلیٰ درجے کی اخلاقی کتاب کہیں سے ہاتھ آگئی جس کی لوح پر لکھا تھا۔ "یہ قدیم الایام کے حکیم سنیکا کی کتاب ہے جس کا ترجمہ منشی عبدالعزیز صاحب نے کیا ہے۔" دیکھتے ہی "پہلی پھر تک اُمین نگہ انتظار کی"

اور شوق ملاقات نے جوش مارا۔ مگر لہنا آسان نہ تھا۔ دل کو یہ کہ کے تسلی دے لی کہ "نہیں ملتے نہ سہی" یہ کیا کم ہے کہ اپنے قدیم علمی مشغلے کو نہیں بھولے خیر۔ جہان رہن خوش رہیں۔

اس کو بھی ایک رات گزر گئی۔ چند روز بعد سنا کہ ہمارے دوست لکھنؤ کے کورٹ انسپکٹر ہو گئے۔ لیکن اب یہ بے دست و پائی تھی کہ وہ تو لکھنؤ میں آئے اور ہم حیدر آباد میں تھے۔ آخر قحوطے دنوں ترسا کے زمانہ میں بھی لکھنؤ میں لے آیا۔ مگر میان آنے کے بعد بھی ہم ایک زمانے تک کچھ ایسے افکار میں پھنسے رہے کہ ملنے کی نوبت نہ آئی۔ مگر کب تک یہ پیرانی کشش نے زور باندھا شروع کیا۔ اور آخر اُن کے دروازے تک پہنچ ہی لے گئی۔ پولیس کی ملازمت نشیب و فراز زمانہ کے تجربوں۔ اور عہدے کی ترقیوں نے اب اُنہیں وہ پُرانا عبد العزیز تو باقی نہیں رکھا تھا۔ لیکن اُن دو چار اگلی ادائیں باقی تھیں جنہوں نے یقین دلا یا کہ جا ہے وہ پُرانا عبد العزیز نے مگر یہ نیا عبد العزیز بھی مرے کا ہے۔ اگلی سا دو گئی کے اوپر متانت و معاملہ بھی کا خلافت بیشک چڑھ گیا ہے مگر بے نگاہی زندہ دلی اور یار باشی تیار ہی ہے کہ اگر یہ وہ پُرانا دوست نہیں تو اُسے یاد ضرور دلاتا ہے۔ اس زندہ دلی کے اندر خلوص کے رنگ کی بھی ہلکی سی پیمائش دکھائی دی۔ اور بھولے سے ”بندہ طلعت آس باش کہ آئے دارد“ پھر میں محبت کا بندہ بنا دیا۔ غرض اگلا اُس تازہ ہو کے ترقی کرنے لگا۔ اور جاہلیت ہو گئی کہ دنیا کے جھگڑوں سے چھٹی ہوئی اور اپنے دوست کے پاس بیٹھے ہیں۔ ہمارے دوست پولیس کے ایک ذی اقتدار اور صاحب اثر عہدہ دار تھے۔ اور ہر وقت اُن کے گرد افسران پولیس کا مجمع رہا کرتا جو چیز بہین کبھی بھی گزرتی۔ مگر اُن کا ٹون کی طرح برداشت کر لیا کرتے جو گلابی بنی کے وقت اکثر اقبالیوں میں چھپ جایا کرتے ہیں۔ ہمیں ادبی مذاق اور جام شاعری کے نشے نے دنیاوی ہنگاموں سے غافل و بے پروا کر دیا ہے۔ چنانچہ لوگ تو ہمارے دوست کی صحبت میں جب دیکھے مقدموں اور فوجداری عدالتوں کے جھگڑوں میں مبتلا رہتے مگر ہمارے خیال کو اُن کے کمرے کی صرف اُن چیزوں سے واسطہ رہتا جو ہمیں آسانی کے ساتھ واقفیت کے پر خطر میدان سے نکال کے خیال آرائی کے پر لطفت باغ میں پہنچا دیتیں۔

غرض ہماری ادب ہمارے دوست کی صحبت کا یہ رنگ تھا کہ کمرے میں

تختوں کا چوکا بچھا ہے۔ ایک جانب میز اور چند کرسیاں ہیں۔ لوگ کچھ کرسیوں پر ہیں کچھ تخت پر۔ اور کسی مقدمے کا تذکرہ چھڑا ہوا ہے۔ دیواروں پر ہمارے کوٹ صاحب کے اگلے مذاق مصوری کی یادگار چند تصویریں ہیں۔ تختوں کے پاس صدر میں ایک دیوان فائدہ بنا ہوا ہے۔ جسکے اوپر والے کانس کے اوپر کی الماری۔ اور الماری کی اوپر والی محراب۔ تینوں دلچسپ کھلونوں اور مٹی کی مورقوں کے مرکز بنی ہوئی ہیں۔ سب کے اوپر ایک پرائی دولت منگی کے سچے حسن و عشق کی تصویر ہے جس میں جہانگیر و نور جہان کی عاشقانہ زندگی کا ایک دلولہ خیز کرشمہ اور بیاب کر دینے والا منظر دکھایا گیا ہے۔ اُسکے نیچے محراب کے اندر چند مٹی کی مورقیں ہیں جن میں کھنڈ کے صاحب کمال کھارنے اپنے ہاتھوں سے مصور کے موقلم اور شاعر کی خیال آفرینی کے کمال کیجا کر دیے ہیں۔ ایک بڑی حسن فردوسی کے شرمناک غرور پر کھڑی اترا رہی ہے۔ ایک دوسری بیٹے کی جواو بن مٹھن کے گھر میں کھڑی ہوئی ہے کہ بیس میان پر اپنی مومنی مورت کا جادو ڈالے۔ ایک مارواڑی دکاندار کی پری جال ہو گھو گھٹ نکالے۔ ایک ہاتھ میں لہنگا سنبھالے اور دوسرے ہاتھ کو ایسی کا فرما جراتی کی ادا سے ایک نازک و دلکش خم کے ساتھ آگے بڑھائے نیلے سے سسرال جا رہی ہے کہ ظلم اُس کی اداؤں کے ادا کرنے سے عاجز ہے۔ ایک ہندو جٹا دھاری بے نیاز مٹی کے لباس میں ہوس پرستی کے کرتے دکھارہا ہے۔ اور ان سب کے بیچ میں ایک نواب صاحب سر پر ٹیڑھی ٹوپی جمائے کھڑے ہیں گویا نظر بازی کا لپکا انھیں حبیبنوں کے مجمع میں لکھنچ لایا ہے۔

اس محراب کے نیچے آتش خانے کی کانس پر ایک سلوٹی اور خیل سلمان دھوبن کندھے پر کپڑوں کی گھڑی ڈالے۔ بائیں کھڑے اپنے شوخ ویدون سے تیار ہی ہے کہ جوانی اور حسن کی دولت خدا کسی زلزل کو نہ دے۔ اُسکے برابر ہی ایک بد قطع دھوبی فقط دھوبتی باز دھے اور کپڑوں کی گھڑی لیے کھڑا ہے۔ اور تیار رہا ہے کہ ان بی صاحبہ کی اصلی حقیقت یہ ہے۔ یوں چاہے اُن کا دماغ عرش پر پہنچ جائے۔

مگر سب سے زیادہ نمایاں اور خوب متاثر و بے ہوش لگتے ہیں جو کلاس کے دو دن سرون پر نہ کھولے نیم خیز بیٹھے ہیں کہ اگلے دو دن پانچ گھنٹے ہیں۔ گویا بڑی مستعدی سے اس عالم مثال اور اس کلی صنف خانے کے دروازے پر بیٹھے پہرہ دے رہے ہیں۔ یہ کتے تمام تصویریں سے بے اور سب سے زیادہ نمایاں ہیں۔ اور اپنے پہرے کی جگہ پر اس مستعدی سے ڈٹے ہوئے نظر آتے ہیں کہ آنے والے کی نظر سب سے پہلے انھیں پھینکتی ہے اور دیکھنے والے کے صفحہ دل پر نقش ہو جاتی ہے

ہم جب حاضرین کی ہیزہ گفتگو سے عاجز آتے اسی صحنہ کی طرف متوجہ ہو جاتے۔ اور وہاں انھیں کتوں پر نظر پڑتی۔ اس عالم میں آنے والوں کے لیے یہ ممکن نہ تھا کہ ان بے ہوشوں کا سامنا نہ ہو۔ وہ نہیں دیکھتے دیکھتے یہ کتے اس قدر خیال میں جم گئے کہ سچیا چھڑائے نہ چھوٹا۔ اور کہیں ہوں اور کسی صحبت میں ہوں اپنے دوست انسپکٹر صاحب کے مکان کا خیال آیا اور خود ان سے پہلے یہ ظالم کتے نظر کے سامنے آئے موجود ہو گئے۔

زمانے نے اپنی عادت کے مطابق پلٹا کھانا شروع کیا۔ کورٹ انسپکٹر صاحب کے نہایت ہی عزیز اور نیک نفس و فرشتہ سیرت بھائی نے نہایت ہی حسرتناک طریقے سے سفر آخرت کیا۔ اور کئی اور بھی جیتی جاگتی صورتیں خاک میں مل گئیں۔ خود ہمارے دوست عبدالعزیز صاحب اپنے ایک مہربان ڈاکٹر کی عنایت سے اتر و پیا کا جام زہری کے ایسے بڑے کہ جینے کی کوئی امید نہ تھی مگر مسیحا نفس ڈاکٹر کی معجز نمانی نے انھیں بستر مرگ پر سے اٹھا کے کھڑا کر دیا۔ اور ساری دنیا حیرت زدہ تھی کہ مردہ کیسے جی اٹھا؟ خیر خدا خدا کر کے خطرہ دور ہوا اور غسلِ صحت بھی ہو گیا۔ مگر چوٹ ایسی نہ تھی کہ دوبارہ ہونے پر بھی اس کا کچھ نہ کچھ اثر نہ باقی رہتا۔ نظر میں ایک اضطراب پیدا ہوا اور دماغ اوہام باطلہ کا مرکز بن گیا۔

پہلے تو ہم نے مدتِ دراز کی جدائی کے بعد ان میں تغیر پایا تھا اب کی آنکھوں سے دیکھتے ہی دیکھتے وہ کچھ سے کچھ ہو گئے۔ صورت وہی ہے شکل

وہی ہے۔ ہنسی وہی ہے۔ مذاق سخن اور مذاکہ سنجی کا ذوق وہی ہے۔ مگر اس سانحہ عظیم کے بعد والے عبدالعزیز اگلے عبدالعزیز کی طرح جفاکش۔ مستعد اور چھڑکے بنے ہوئے نہیں بلکہ شیشے کے بنے ہیں۔ سمجھتے ہیں کہ گھرے باہر نکلے یا دہلیز کے باہر قدم رکھا اور ٹوٹ گئے۔ مجال نہیں کہ اپنے مسکن کو چھوڑیں اور کسی چیز کی ٹھیس نہ لگ جائے۔

بعض با مذاق طبیعوں نے یہ شکوہ چھوڑا کہ یہ خرابی تجربہ کی وجہ سے ہے شادی ہوتے ہی سب شکایتیں رنج ہو جاتیں گی۔ چند لوگوں نے سنج بھی کیا مگر بعض احباب اس طرح سر ہوسے کہ جھٹ پٹ دو ٹھن بیاہ ہی لائے۔ اور چٹ منگنی پٹ بیاہ کا تاشا نظر آگیا۔ مگر اب بھی ہمارے دوست کا جسم شیشے ہی کا تھا۔ اتنا بھی توتہ ہوا کہ گرم پانی کا تاؤ دی ہوئی چینی کی طرح شیشے کے اس نازک جسم میں تھوڑی بہت قائم الناری ہی پیدا ہو جاتی۔ بہر حال اب ہمارے دوست بالکل ہلے ہوئے ہیں۔ اور جس دماغ نے دنیا میں بڑے بڑے کام کیے تھے۔ جو نازک سے نازک چید گیون کو گھڑی بھر میں مٹا کر دیا کرتا اور جو بڑی بڑی کھینوں کو سلجھا دیتا تھا آج عسبدان صغہ دماغ نے نازکے دارم زخود سیار می زخم

سو اپنے شیشہ جسم کی حفاظت کے اور کسی کام کا نہیں۔ لاکھ چاہا کہ دماغ سے اگلا کام لین مگر اُس نے قطعاً جواب دیدیا۔ اور سو اس کے کہ وظیفے کی درخواست دے کے خدمت سے علیحدہ ہو جائیں کوئی مقررہ نہ آیا۔

اب ریٹائر ہو جانے کے بعد وہ صحبت ہی درجہ بدرجہ ہو گئی۔ جو لوگ روز روز دو وقتہ حاضری دیا کرتے تھے ان کی صورتیں برسوں بلکہ زندگی بھر کے لیے نظر سے اوجھل ہو گئیں۔ کمرے میں ہر وقت جو جھگڑا لگا رہتا تھا خواب و خیال ہو گیا۔ اور اگر بھولے سے کوئی آ نکلتا ہے تو یہاں کا سناؤ دیکھ کے بے اختیار کہہ اٹھتا ہے کہ ”حیت در چشم زون صحبت یار آخر شد“

یہ سب ہو گیا۔ مگر وہ لڑاگ گئے اُسی ٹھاٹ، اُسی وضع۔ اور اُسی شان سے اُس عالم گلی کے پھاٹک پر بیٹھے ہوئے ہیں۔ جس جہنستان کی وہ

نگہبانی کر رہے ہیں اس میں بھی بہت کچھ انقلاب ہو گیا ہے۔ بازاری کس اور ہنڈ
 بیٹے کی جو رو دو نوں کا حسن ماند پڑ گیا۔ ارواڑی بیٹے کی ہو کا حسن و جمال اور
 گھوٹ گھٹ تو وہی ہے مگر ناز بھرا اٹھ جو ایک نزاکت کے خم کے ساتھ آگے بڑھا
 رہتا تھا ٹوٹ گیا۔ اس عالم بگل کی کئی دلفریب موثرین غائب ہو گئیں۔ غرض سب
 کو زوال اور انقلاب نے کچھ نہ کچھ نقصان پہنچا دیا۔ اپنی حالت پر قالم میں
 تو وہی دو نوں بلڈاگ جھوٹے جامِ حضور کا جھوٹا پی کے ابد کے دامن سے
 اپنا دامن باندھ لیا ہے۔

اب بھی جب کبھی اُس کرے میں جائے تو ایک خبر تاک سناٹے کے
 ڈھنڈلے میں سب کے آگے یہ بلڈاگ کی چوڑی نظر آتی ہے جو ہر آنے والے کی
 نگاہ کو اپنی طرف کھینچ لیتی ہے۔ اور جو تھاک خاموشی کے اندر یہ منظر دیکھ کے
 دل دہل جاتا ہے کہ ایک طرف ہمارے دوست کورٹ اسپیکٹر صاحب اپنے
 آگے جھکے ہوئے سر کو دو نوں ہاتھوں سے پکڑے بیٹھے ہیں اور سامنے آتشخانے
 کی کمانش پر یہ دو نوں گتے تیار ہیں کہ اس خاموش عزت نگاہ اور اس حریم
 عبرت میں جو کوئی قدم رکھے اُس کی صورت دیکھنے ہی بے اختیار بھینک اٹھیں۔
 اصل یہ ہے کہ اب تو ہم بھی اُن مکتوں سے خائف ہیں کہ دیکھیں یہیں
 بھی زندہ چھوڑتے ہیں یا نہیں۔ اور سامنا ہوتے ہی اکثر اُن کی طرف دیکھتے
 دل میں یہ شعر پڑھ لیا کرتے ہیں

ندام کہ تیر خدنگ قصا مرا بشکند پیشتر یا ترا

ہمیرا من تو تا

ہمارے شاعروں نے لبّ اور پیچھے وغیرہ کی نغمہ سنجی و شوریدہ بیانی
 سے تو اپنے پُر سوز کلام میں جا بجا فائدہ اٹھایا۔ مگر سرخ رُو و زمردین پیرہن
 توڑنے کی طرف کبھی توجہ نہ کی جو پری جمال مہ جینیوں کا پرانا انیس محبت اور
 سچا ہمد و ہراز ہے۔ جو لوگ سب لیلیٰ کے دلدادہ ہوں اُن سے اتنی بڑی

اجم فرو گزاشت قابل معافی نہیں ہو سکتی۔

تو تا اور متیاد و نون حسنین کے پارے مصاحب و محفل جانان کے زبان آور و بذلسخ قدیم ہیں۔ مگر ہشتی خلعت پہنے والے توتے کو دلدار ناز آفرین کی مصیبتی کا جس قدر موقع ملا ہے بھولی بھالی سیہ پوش مینا کو نہیں نصیب ہوا۔ ہندوستان کی مشہور و معروف ہوش پداوٹ کا سب سے بڑا احمد و ہمراز اور ولداری کرنے والا مصاحب وہ عجیب و غریب توتا تھا جسکے لیے پہلے پہل ”ہیرامن“ (جواہر طبع) کا خطاب تجویز کیا گیا۔ اور جی برکت سے اُس کی ساری نوع یعنی ہر توتے کا نام ”ہیرامن“ قرار پا گیا۔

اور توتے تو فقط سنے سنائے فقرے زبان سے ادا کر دیا کرتے ہیں مگر ہیرامن کو خذ نے زبور عقل سے اس قدر آراستہ کیا تھا کہ پداوت سے بے تکلف باتیں کرتا۔ اُس کی سنتا۔ اپنی کہتا۔ اور شکل معالون میں مشورہ دیتا۔ اسی قدر نہیں۔ اس توتے نے چتور کے راجہ رتن سین کے ساتھ اسکی نسبت ٹھہرائی۔ عالم حسن و عشق کا نامہ بر بنا۔ محبوب کا سفرین کے گیا۔ او جواب لایا۔ جن واقعات کو بھاکا کے جادویان شاعر ملک کچھ جاسی نے اپنی منظوم کتاب پداوت میں تفصیل و تشریح سے بیان کیا ہے۔

اس توتے کے حالات کو اکثر لوگ ایک بے بنیاد کہانی خیال کرتے ہیں۔ ممکن ہے کہ ایسا ہی ہو۔ مگر توتے کی گفتگو میں اکثر سمجھ اور ارادہ پایا گیا ہے اور بعض اوقات اُس نے ایسی ہوش و حواس کی باتیں کیں کہ سننے والے دنگ رہ گئے۔ چنانچہ تاریخ گجرات ”مرآۃ سکندری“ میں مذکور ہے کہ دولت منلیہ کے نامور شہنشاہ ہمایون نے گجرات کے فرمانروا بہادر شاہ پر فوج کشی کی تو قلعہ جانتانیر کا محاصرہ کیا جو بہادر شاہ کا مستقر اور اسکی قلم کا سب سے زبردست قلعہ تھا۔ اور سلطان بہادر کا معتد علیہ سپہ سالار اور میر ارتش یعنی ناظم توپ خانہ رومی خان ہمایون سے مل گیا۔ اور اپنی سازش سے قلعہ پر مغلوں کا قبضہ کر دیا۔ فتح کے بعد جب وہاں کا مال غنیمت ہمایون کے دربار میں پیش کیا گیا تو اس میں ایک زبان دان توتا بھی تھا جو آدمی کی طرح باتیں

کر تا اور سمجھ کر بات کا جواب دیتا۔ سلطان بہادر اُسے ایسا چاہتا تھا کہ سونے کے پنجرے میں رکھتا تھا۔ شاہانہ اہتمام سے اُس کی داشت کی جاتی اور خلوت و خلوت میں ہر گھڑی فرمان روے گجرات کا مولس و ہدم رہتا۔ جب وہ ہمایون کے سامنے پیش ہوا اور اُسکی صفت بیان ہو رہی تھی کہ چوہدریوں نے عرض کیا ”رومی خان حاضر ہے“ اُسے باریابی کی اجازت دی گئی۔ اور جیسے ہی وہ تخت شاہی کے سامنے آئے آداب بجالایا۔ تو نے اُس کی صورت دیکھتے ہی کہا ”بھٹ پانی رومی خان نکھر ام“ تو نے اُس کے اس کلمے کے ساتھ ہی رومی خان کی آنکھیں غمراہت سے جھک گئیں۔ سارا دربار متحیر ہو گیا۔ اور ہمایون نے کہا ”رومی خاں۔ یکنم کہ جانورست ورنہ زبانش می بریدم“ یعنی رومی خان کیا کروں مجبور ہوں کہ یہ جانور ہے ورنہ اس کی زبان کاٹ لیتا۔

تو نے کی زبان آدھی و زبان دانی کے صدمہ قلعے ہماری صحبتوں میں مشہور ہیں۔ جن میں چاہے کسی قدر مبالغہ ہو مگر اصلیت سے خالی نہیں ہیں۔ خود ہمارے گھر میں ایک تو تھا جس کا بیچرا اور وازے کے قریب ٹکا رہتا۔ جہاں دروازے پر کسی فقیر نے صدانگائی وہ بے تکلف کہ دیا کرتا ”شاہ جی لیتے جاؤ“ فقیر کسی چھوٹے بچے کی آواز خیال کر کے اُس قسم کی دعائیں دینے لگتا جیسی کہ بچوں کو دی جاتی ہیں۔ اسی طرح ہمارے ہی بیان کے ایک اور معمولی تو نے کا واقعہ ہے کہ گھر تمام لڑکے ایک محترم بزرگ خاندان کو ”بابا“ کہا کرتے۔ تو ابھی اُنکو بابا کہنے لگا۔ ایک دن اُس کا بیچرا بالا خانے پر ٹکا ہوا تھا کہ ایک بڑا بھاری بندر آ کے اُسکے پنجرے کو اٹھالے چلا۔ ساتھ ہی تو نے غل مچایا ”ارے بابا! ارے بابا!“ سب کو خبر ہو گئی۔ اور بیچرا بندر کے ہاتھ سے چھینا گیا۔

یہ واقعات بتا رہے ہیں کہ تو فقط بولیاں نہیں سیکھتا بلکہ بعض اوقات اُس میں اتنی عقل آ جاتی ہے کہ سمجھ کے بات کا جواب دینے لگتا ہے۔ یا اپنی سکی ہوئی بولین کو ٹھیک موقع اور صحیح محل پر استعمال کرنے لگتا ہے۔

انگریزوں میں بھی ہمارے بیان کی طرح توتے کے باتیں کرنے کے صد ہا وقت
مشہور ہیں۔ چنانچہ رائیسن کرو سو کے افسانے میں جو بعض لوگوں کے نزدیک
تاریخی واقعہ ہے ایک توتے کی باتوں کا ذکر ہے۔ جس نے غربت و بیکسی میں
اُس کی مدد کی تھی۔

اسی وجہ سے یورپ کی مہ جین دلربائیں بھی توتے کی دلدادہ ہیں۔ دربار
حُسن میں توتے نے اپنی باتوں سے ایسی خصوصیت حاصل کر لی ہے کہ ہر
پری جمال نازنین کا محبوب دوست اُس کا تو تا ہی ہوا کرتا ہے۔ فسانہ عجائب
ایک فرضی قصہ ہے اور اُس میں داستان کا آغاز توتے ہی سے ہوا ہے۔ جافلم
نے ایک بولتا تو تا مول لیا۔ گھر میں لایا۔ اُس کی ملکہ نے اپنے حُسن پر ناز کیا۔
توتے نے اُسکے حُسن کی مذمت کر کے ایک دوسری مہ جین انجمن آرا کے
حُسن کی تعریف کی۔ اور جان عالم کو اُس کا عاشق بنانے دیوانہ بنا دیا۔

اس قصے میں توتے کا خیال غالباً پر بات کے دہنے سے لیا گیا ہے۔
لہذا اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ مشرقی حُسن و عشق کے عالم میں تو تا
کیا چیز ہے۔ اور حسنین کے ساتھ اُسے کیسی خصوصیت ہے۔ اسی کا ایک
کرشمہ یہ ہے کہ جس طرح ہندوستانی دیوالا میں حسین دیویوں کے خاص خاص
شعار اور باتیں مقرر کر دیے ہیں۔ مثلاً کسی دیوی کا شعار مورت ہے۔ کسی کا
شعار یہ ہے کہ ہاتھی اُس پر بار چڑھا رہا ہے۔ اُسی طرح بیان کی عام دل ربا
نازنینوں اور پری و ش مہ جینوں کا شعار اور بات اکثر تو تا قرار کیا ہے۔ اگلے
مصوروں نے اگر کسی مشوق کی تصویر بنائی ہے تو اُس کے پاس ایک تو تا
بھی بنا دیا ہے۔ جس سے باتیں کر کر کے وہ خوش ہو رہی ہے۔ عشرت کدہ
ناز میں وہی اُس کا دل ہلانے والا مونس تنہائی ہے۔ اور اُسی پر اُسکے
دل کے جذبات آشکارا ہوتے ہیں۔

محبوبوں کے ایسے رفیق و انیس کی طرف سے حُسن پرست شاعروں کا
اس قدر غافل ہو جانا بڑی حیرت کی بات ہے۔ کیا وہ اُسے اپنا رقیب سمجھے؟
ایسا ہونا کوئی تعجب کی بات نہیں۔ اس لیے کہ رقابت کا وہم ادنیٰ ادنیٰ چیزوں

اور معمولی باتوں پر ہو جایا کرتا ہے۔ دل اسکو مشکل سے گوارا کرتا ہے کہ جسے ہم چاہتے ہیں وہ کسی اور کی طرف متوجہ ہو یا کسی دوسرے سے باتیں کرے۔ لیکن ایسا تھا بھی تو قوتے کی شکایت کیا کرتے۔ ہمارے عاشق مزاج رقیب جلتے ہیں۔ اور جلتے ہی کی وجہ سے اُس کی شکایتوں کا دفتر کھول دیا کرتے ہیں۔ مگر قوتے کی رقابت میں کیا خصوصیت ہے کہ اُس کا نام بھی نہیں لیا جاتا۔ غرض ہمارے نزدیک اسکی کوئی صحیح توجیہ نہیں ہو سکتی۔ اور وراثت عاشقانہ شاعری کی یہ بڑی فرد گذاشت گذاشت ہے۔ لہذا ہمارے شعرا کو چاہیے کہ بستی اس غلطی کا اعتراف کریں۔ اور آمینہ تو تمام مضامین حسن میں ضرور شامل کر لیا جائے۔

تو تمام علاوہ حسنینوں کا محرم راز ہونے کے خود بھی حسن کا ایک مکمل نمونہ ہے۔ اُس کی سُرخ پاؤت کی سی چونچ چوہری جالون کی تاک کے مشابہ ہے کس قدر خوبصورت ہے؟ اسکی نازک اندام کی کسی دلکش ہے؟ اور پھر اس نزاکت پر اُس کا ہشتی سبز حلقہ جو ظاہر کرتا ہے کہ وہ خاص جنس سے حوروں کے ہاتھ سے سیا ہوا جوڑا ہیں کے دنیا میں آیا ہے۔ اور سنت سے نہیں آیا تو کسی ناز آفرین و شوخ طبع محبوبہ نے اُسے اپنا دھانی دوپٹہ اڑھا دیا ہے۔ یہ سب چیزیں ایسی ہیں کہ اس نازک اندام و خوش جمال طائر کو بجائے خود ایک محبوبہ و لربا ثابت کر رہی ہیں۔

عالمگیر قتال مغرب

دنیا والوں کی آج تک ہمیشہ کٹتے مرتے ہی گذری ہے۔ یہ سب جانتے ہیں کہ امن و امان سے بہتر کوئی نعمت نہیں۔ تہذیب اور علمی ترقی ہمیشہ ہی تعلیم دیتی ہے کہ صلح جوئی سے بہتر کوئی اخلاقی خوبی نہیں ہے۔ انسان کا نام انسان اسی لیے رکھا گیا ہے کہ اس میں انس اور میل جول کے جذبات ہیں۔ اور وحشی درندوں کی طرح ایک دوسرے کے خون کا پیاسا رہنا اُس کا کام نہیں

لیکن حیرت اور بڑے تعجب کی بات ہے کہ یہی انسان جس نے اپنا نام انسان رکھا ہے اُس سے بھی بے لٹے بھڑے نہیں رہا جاتا۔ تعلیم۔ تہذیب۔ سب اخلاق سب خاموشی کی زندگی بسر کرنے کی ہدایت کرتے ہیں۔ مگر اسکی حالت ہے کہ علم و فضل اور تہذیب و معاشرت میں جس قدر ترقی کرتا جاتا ہے اُسی قدر زیادہ لڑاکا اور خونخوار ہوتا جاتا ہے۔

موجودہ دور تہذیب سب سے زیادہ مدعی امن ہے۔ کہا جاتا ہے کہ آج کل کی شائستگی نے خوریزی موقوف کر دی۔ اور جہان میں اس جدید تہذیب کا اثر پڑا ہے وہاں قتل و خون کا بازار سرد پڑ گیا ہے اور لوگ نہایت ہی امن و امان کی زندگی بسر کرنے لگے ہیں۔ اگلی خون ریزیوں کا الزام مذہب کو دیا جاتا ہے کہ صرف اپنے عقائد کے تسلیم کراتے اور اپنے گروہ کی بات پالا کرنے کے لیے وہ ملکوں میں فحشیر قتال بلند کرتا تھا۔ اور موجودہ تہذیب نے چونکہ مذاہب کا اثر کمزور کر دیا ہے اس لیے لوگوں میں خوریزی موقوف ہوئی اور دنیا کو پنپنے کا موقع ملا ہے۔

لیکن تجربے نے آخر کار ان دعووں کو بھی توڑ دیا۔ اور ہم دیکھ رہے ہیں کہ ان حاملانِ اولے تہذیب اور برہم گمان صفوفِ ادیان کے ہاتھوں سے ایسی خون ریزی ہو رہی ہے جیسی کہ آج تک دنیا میں کبھی نہیں ہوئی تھی۔ اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ علم و فضل اور تہذیب و تمدن میں جو حسن اور فرائض کامرتبہ آج کل دنیا کی تمام قوموں سے بڑھا ہوا ہے۔ اور ان کے بعد سب سے اعلیٰ درجہ انگلستان اور امریکہ کا خیال کیا جاتا ہے جن کی نسبت یہ رے قائم کی گئی ہے کہ تحصیل زر کو علمی ترقی کے شوق پر ترجیح دیتے ہیں لیکن افسوس تین اکثر کے ہاتھوں سے آج کل دنیا پر ایسے ظلم ہو رہے ہیں اور نوع انسان اس برحسی سے قتل ہو رہی ہے کہ اُسکی نظیر سے دنیا کی تاریخ خالی ہے اور کبھی مذاہب کے ہاتھوں سے ایسا قتل عام نہ ہوا تھا۔ دولتِ برطانیہ نے بہت الگ رہنا چاہا مگر نہ بن پڑی اور مجبوراً اُسے بھی اپنے ہاتھوں میں رنگنا پڑے۔

تایخ عالم کے آغاز میں چین مشرق میں تھا بھارت اور رمان کی طرف
اور مغرب میں ٹرک کی معرکہ آرا سیان نظر آتی ہیں۔ اول الذکر دونوں دوائوں
کے مرد میدان ہندو اور تیسری جنگ کے سورما یونانی تھے۔ دونوں کے
شعرا اپنی ان لڑائیوں کو دنیا بھر کی لڑائیوں سے بڑا بتاتے ہیں۔ لیکن سچ
پوچھیے تو تینوں میدان قومی اور العزیز اور مقامی سپہگرمی کے اعلیٰ ترین نکل
منور تھے۔ مگر ان کے حالات کے بیان کرنے میں شعرا نے قوم نے بہت ہی مبالغہ
کیا ہے۔ کیونکہ اُس عہد کی قلت آبادی کے لحاظ سے نہ ان میں جانا زادوں
کی اتنی کثرت ہو سکتی تھی اور نہ موجودہ ذرائع سفر کے مفقود ہونے کی وجہ سے
ان کی خون ریزی کا میدان اتنا وسیع ہو سکتا تھا۔

اُس کے بعد ہزاروں سال تک اسی قسم کی حملہ آوریوں اور خونریزیوں کا
میدان گرم رہا۔ اسیر یا و بابل والوں کا ارض یہودا پر آنا اور ساری نسل اسرائیل
کو تباہ کر دینا۔ زر کشنیر کا (جسے بعض محققین کخیس و عجم خیال کرتے ہیں) میں کسی
لاکھ سپاہیوں کے ساتھ یونان پر چڑھائی کرنا اور بحری لڑائی میں بالکل تباہ
ہو جانا۔ رومیوں کا قرقاطینہ والوں سے لڑنا اور انھیں تباہ کرنا۔ کوئٹہ اور
ہن کی سی وحشی قوموں کے سیلاب کا ملک روم میں آنا اور رومی تمدن و
تہذیب کا غارت ہونا۔ صحرائی تہذیب عرب کے عالمگیر لشکروں کا عرب سے نکلنا
اور مشرق سے مغرب تک ساری تہذیب دنیا کو زیر و زبر کر دینا۔ صلیبی مجاہدوں
کے ٹڈی دل کا کوہستان آپس سے نکل کر بنی اسرائیل کی موجودہ زمین پر گھرنا
اور صدیوں تک خالص دینی مقاصد پر نوع انسان کی قربانی ہوتے رہنا۔
اور سب کے آخر میں قراقرم کی گھاٹیوں اور دشت قیچاق کے صحرا سے تاتاری
درندوں کے طوفان کا اٹھنا اور عربی تہذیب کے ساتھ لاکھ آدمیوں کو عدم آبادی
میں اڑا لے جانا۔

سب ہوا۔ اور اس میں خدا کی کوڑوں مخلوق تلواریں گھاٹ اُتری۔
مگر وہ وحشی تھے، جاہل تھے، غیر تہذیب تھے، اور تمدن سے مس نہ رکھتے تھے۔
لیکن تہذیب دنیا میں تعلیم و تہذیب کے اعلیٰ ترین کمال پہنچنے کے بعد بھی

خون کا سیلاب ہے۔ اور انسان کی سی بے نظیر امانت خاک میں ملائی جائے تو پھر بہن ہی کہتے بنتا ہے کہ یہ مثل ”لاکھ طوطے کوڑھایا پر وہ حیوان ہی رہا“ جانوروں ہی تک محدود نہیں بلکہ انسان کو ہزار پڑھائیے لکھائیے۔ لاکھ مہذب و ثنابتہ بنائیے اصل میں وہ ایک خوشوار و زندہ ہی ہے۔ صلح کی برکتوں کا یقین رکھنے اور امن و امان کے فائدوں سے واقف ہونے پر بھی ادنیٰ سی چھڑ پر لڑ ہی پڑتا ہے۔

انگلی غیر مہذب لڑائیوں کے بعد اب ہم مہذب لڑائیوں کا ذکر کرتے ہیں۔ ان کا آغاز نیپولین بونا پارٹ کی الوالفرمیوں سے ہوا۔ جس نے سارے یورپ اور مصر و شام میں ہل چل ڈال دی اور اپنی ملک گیری کی ہوس پر لاکھوں آدمیوں کی قربانی چڑھائی۔ اُس کے بعد اسی مہذب کا تقاضا ہوا کہ دولت عثمانیہ کو جس سے یونیش پانا دشوار تھا رفتہ رفتہ کمزور کیا جائے۔ پہلے یونینو کی بحری لڑائی میں زبردست دول یورپ نے مل کے عثمانی بیڑے کو بالکل تباہ و غرق کر دیا۔ اور ہزاروں آدمی بحر قنائن غرق ہوئے۔ پھر کرمیا کی لڑائی ہوئی جس میں مہذب دول یورپ کا مقصد یہ تھا کہ روسی اور جنوب میں بڑھنے نہ پائے۔ اور ترکوں کو کسی قسم کا فائدہ نہ ہو۔ لہٰذا کھا خلقت اس لڑائی میں بھی ضائع ہوئی۔ اسکے بعد فرانس و جرمن کی پہلی لڑائی ہوئی جس میں لاکھوں زندگان خدا جرمی کے شوق ملک گیری پر بھیشت چڑھے۔ بعد ازاں روسیوں اور ترکوں کی لڑائی ہوئی جس کے لیے ایک زمانہ سے اُنکے صوبوں میں فساد کرایا جاتا تھا۔ اُنکے درنا کو دشمن دی جاتی تھیں۔ انکی رعایا میں شورش پیدا کرانی جاتی تھی آذربائی چھڑ گئی۔ اور مہذب و بد مہذب دونوں طریقوں سے لاکھوں آدمی دونوں حربوں کی فوج اور زر مگاہ کی رعایا میں سے قتل ہوئے۔ ترکوں نے آخر کئی صوبے آزاد کر کے جان چھڑائی اور امن و امان قائم کرنے کی فکر کرنے لگے۔ مگر زبردست فتنہ پردازوں کی سازشوں کے سامنے ایک کمزور صلح جو کا کیا زور چل سکتا تھا۔ کبھی چین سے بیٹھنا نہ نصیب ہوا۔ مہذب دنیا کا یہ عام مشغلہ تھا کہ جب کوئی اور فکر نہ ہوتی

تو جزیرہ نامے بلقان اور قلمرو عثمانیہ کے پالیسکس میں مفسدانہ دخل دہی شروع ہو جاتی۔ یہ سلسلہ جاری تھا کہ جاپان (جس نے مغربی عقابوں کی نظر سے بیخ کنی کے اپنے آپ کو سنبھال لیا تھا) اور ہندوستان مغرب ہی کا سامہند بن گیا تھا۔ سر اٹھایا اور ختم ٹھوک کے روس کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ بحری و بری دونوں لڑائیوں میں ہوئیں اور لکھو کھا آدمی دونوں کے اغراض حکمرانی پر قربان ہوئے۔ آخر بڑی مصیبت سے روس نے جان بچائی۔ اب چند روز بعد تہذیب کا یہ تقاضا ہوا کہ اسلامی سلطنتوں کا خاتمہ کر دیا جائے۔ ایران سے مرآت تک ہر جگہ لڑائی پھڑک گئی۔ روس نے ایران کی پھر پھر اٹے والی بے بس رعایا کو دیوچا۔ اٹلی نے بے پوجھے پچھے اور بے وجہ موجہ طرابلس کے ساحلی شہروں پر قبضہ کر لیا۔ فرانس نے پڑھ کے مراکو کا گلہ دایا۔ پھر جب اقصیٰ تہذیب کے صلح پسندوں نے دیکھا کہ اٹلی کا طرابلس پر کوئی زور نہیں چلا سکتا ہارے رہتا ہے۔ اور اُس کے حواس بجا نہیں۔ تو سب طرف سے تقاضا ہوا کہ دولت عثمانیہ طرابلس سے دست بردار ہو کے صلح کر لے۔ اور کچھ ایسی ریشہ دوستانیان، چالاکیان اور سازشیں کی گئیں کہ عثمانی وزارت نے اسکو قبول بھی کر لیا۔

ادھر مہذب احباب یورپ کی صلاح سے اس صلح نامے پر دستخط ہوئے اور اُدھر انھیں کہ مفراتوں کی غنایت سے تمام ریاستہائے بلقان نے دولت عثمانیہ کے مقابلہ میں اشتہار جنگ دے دیا۔ اور سارے جزیرہ نامے بلقان میں خون کی ندیاں بہنے لگیں۔ دولت عثمانیہ ان سب کے مقابلہ میں کمزور نہ تھی۔ مگر حسن تدبیر سے وہ کمزور کر دی گئی۔ جان باز سپاہیوں کو سپیٹ کی روٹی اور سامان جنگ دونوں سے محروم رکھ کے پٹوایا گیا۔ اور آخر نتیجہ یہ ہوا کہ سوا تھوڑے سے مشرقی علاقہ یورپ کے جو قسطنطنیہ کے حوالی میں ہے تمام مقبوضات یورپ دولت عثمانیہ کے قبضے سے نکل گئے۔ اور جن علاقوں پر نصراتی ریاستہائے بلقان کا قبضہ ہوا تھا ان میں مسلمان رعایا پر ایسے معاملے ہوئے کہ سننے سے روئیں کھڑے ہو جاتے ہیں۔ غرض لاکھوں خلقت میں

کے زمانے میں بھی تہذیب یورپ کی نذر ہوئی۔

لیکن جو دولت ترکان آل عثمان سے چھینی گئی تھی اسکا معضم ہونا آسان نہ تھا۔ غیر منقولہ مال غنیمت کی تقسیم میں دشواریاں پیش آئیں۔ اور اُس کی کامیابی کے جوڑی کی ایک ایسی صاحب علم و فضل قوم نے جو موجودہ ترقیوں کا اعلیٰ ترین نمونہ تصور کی جاتی تھی، روس کے مقابل اشتہار جنگ دیا۔ اور فرانس پر صدمہ اس لیے کہ وہ سلطنت روسیوں کی دوست ہے فوج بڑھائی۔ لیجیم کی غیر جانبداری کے قائم رکھنے کا جو پرانا عہد نامہ تھا اُس کے ساتھ خود لیجیم کو بھی پامال کر ڈالا۔ جس کی وجہ سے انگلستان کی ایسی صاحب علم اور صلح جو سلطنت کو بھی اس کے خلاف اشتہار جنگ دیدیا پڑا۔ اور ایک ایسی لڑائی چھڑ گئی جو دنیا کی تمام گذشتہ لڑائیوں سے زیادہ خوفناک ہونے کے ساتھ ساری دنیا میں پھیلی ہوئی ہو۔ یورپ میں چار طرف شمال و مشرق میں روس و جرمن کی سرحد پر۔ وسط یورپ میں روس و آسٹریا کی سرحد پر۔ شمالی بلقان میں سرویا و آسٹریا کی سرحد پر اور مغربی یورپ میں لیجیم اور فرانس میں کئی ہزار میل کی مسافت پر خون کا مینہ برس رہا ہے۔ ایشیا اور انہماے مشرق میں سواصل چین پر۔ افریقہ میں زنجبار سے لیکے شمالی و مغربی سواصل افریقہ تک۔ آوشینیا یعنی جزائرستان میں آسٹریلیا اور نیوزیلیینڈ کے پاس کے جزائر میں خوزینی ہو رہی ہے۔ اور سمندر جو اگلے دنوں آزاد رہا کرتا تھا آج کل عموماً خطرناک ہے۔ اور جو خطرہ بالگاہ اور نارنگی کے سواصل سے شروع ہوا اُس سے اٹلینٹک اوسن۔ بے شک اوشن۔ آرکٹک اوشن اور انڈین اوشن تک خطرہ سے خالی نہیں ہیں۔

بلقان کے مظلوم مسلمان مسندھی کا یہ شعر پڑھ رہے ہیں

دیہی کہ خون ناحق پروانہ شمع را
چند امان مذاک سب را سحر کند
اور بہین ہند قہون کا یہ رنگ و کیکہ کے ہی ماننا پڑتا ہے کہ تہذیب و شائستگی سوا اسکے کہ انسان کو لڑائی کے لیے زیادہ تیار کرے اور اُس کی خون ریزی کی قوت و ہوس کو اور بڑھائے اور کچھ نہیں کرتی۔

موسیٰ ندی! موسیٰ ندی!!

حیدر آباد دکن میں جو ہمیت ناک اور تباہ کرنے والا سیلاب
موسیٰ ندی سے آیا تھا اُس پر مولانا نے یہ مضمون اکتوبر ۱۹۳۷ء
کے دکن از میں تحریر فرمایا۔

موسیٰ ندی! موسیٰ ندی!! تو نے حضرت موسیٰ کلیم اللہ کا نام اختیار کیا ہے۔
اور تیری بڑوس عیسیٰ ندی نے جو حیدر آباد سے دوہی ڈھانی میل پر قحط سے
آکے ہم آغوش ہو گئی ہے حضرت عیسیٰ کا نام۔ اور اعلیٰ حضرت سربراہ دکن کے
دارالسلطنت میں جیسی شان و شوکت نمودار ہوئی اُس سے ہم کو یقین آ گیا
تھا کہ تم دونوں سے ید بیضا کا میجرہ بھی نمایاں ہو رہا ہے اور احیاء موات
کا بھی۔

سہم تیری سطح پر آفتاب کی کرنوں کو کسی کی پریشان پشیمانی کی طرح
چمکتے دیکھتے تو اُسے ید بیضا تصور کرتے۔ اور ہر مرتبہ جب ہم اپنے تاجدار
گردون مدار کی فیاضی سے کسی کو نہال ہوتے دیکھتے تو اسے احیاء
موات کا میجرہ سمجھتے۔

مگر موسیٰ ندی! موسیٰ ندی!! بہن تیری میجرہ نانی کے اس پہلو کا خیال ہی
نہ تھا کہ تو ید بیضا کے بجائے حضرت موسیٰ کا عصا بھی بن سکتی ہے۔ عصا
موسیٰ کی شان دکھانی تھی تو کاش یہ رحمت دکھائی ہوتی کہ ”فَاَنْفَجَرْتُمْ مِيْنَهَا
عَشْرَةً عِيْنًا“ (جاری ہوئے اُس سے بارہ چشمے) تجھ سے دس بارہ ندیاں
ندیان حیدر آباد جاری ہو جائیں۔ اُن سے سرکار عالی کا ملک پہلے سے زیادہ
آباد ہوتا۔ اور رعایا کی مرفہ الحالی ترقی کرتی۔ لیکن موسیٰ ندی! تجھ سے تو
عجب شان قمار کی ظاہر ہوئی۔ تو ایک آنا فنا عصا موسیٰ سے وہ
عظیم الشان ازاد بن گئی۔ جو دم بھر میں مصر کی ہزار ہا خلقت کو نکل گیا تھا۔

جس نے ایک چشم زدن میں مصر کی آبادی صاف کر دی تھی۔ افسوس موسیٰ ندی! ہمیں تجھ سے ایسی امید نہ تھی۔

عصاے موسیٰ کا ایک معجزہ یہ بھی تھا کہ سمندر میں راستے ہو گئے۔ پانی جہان تھا وہیں دیواروں کی طرح ٹھہر گیا۔ ہمارے زمانے کے آہنی یون کی طرح اُن میں جھنجھریاں بن گئیں۔ اور بنی اسرائیل کے بارہ سبط بارہ راستوں سے ایک دوسرے کو دیکھتے بھالتے اطمینان و قانع الہیاتی سے پار چلے گئے۔ اور ایک معجزہ یہ بھی تھا کہ فرعون کے لشکر نے جیسے ہی اُس دریائی راستہ میں قدم رکھا پانی جوش و خروش کے ساتھ مل گیا۔ سمندر تھامری کی شان سے اُبلنے لگا۔ قیامت کا کلام نمودار ہوا اور دم بدمیں اُس لشکر کا پتہ نہ تھا کہ کیا ہوا اور کدھر گیا۔ زمین کھانگی یا آسمان کھا گیا۔

بیشک ہم گنہگار ہیں۔ سر سے پاؤں تک معاصی میں ڈوبے ہوئے ہیں۔ ہمارا بال بال گناہوں سے گندھا ہوا ہے۔ مگر موسیٰ ندی اہم سب خدا پرست ہیں۔ ہمارے شرک بھی فی الحقیقت موجد ہیں۔ ہمارے کفار بھی اُس ذات و وحدہ لا شریک کے منکر نہیں۔ پھر ہمارے ساتھ تجھے ایسا سلوک نہ کرنا چاہیے تھا۔ ہم پر یہ جوش غضب ظاہر کرنے کی ضرورت نہ تھی۔ ہمارے ظل اللہ اکبر اللہ کہ سچے خدا پرست اور خدا کے برحق دین کے حامی و مربی ہیں۔ ہمارے مدارا لہام تصوف کے رنگ میں رنگے ہوئے اور دریائے وحدت و معرفت میں غرق ہیں۔ ایسے نیک لوگوں اور ایسی خدا پرست آبادی کے ساتھ وہ وہ سلوک جو کبھی فرعون اور اُس کے لشکر کے ساتھ کیا گیا تھا! موسیٰ ندی! انصاف یہ ہے کہ تیرا یہ جوش بے محل اور تیرا یہ غیظ و غضب بے موقع نہ تھا! ہم سید کا سہی۔ مگر اتنے بدتر بھی نہ تھے کہ تو ہمارے حق میں عصاے موسیٰ کی شان تھامری دکھانے کے لیے خلقت کو نگل جانے والا اژدہا بن جائے۔

موسیٰ ندی! موسیٰ ندی! تیرے اس سیلاب کو کوئی طوفان نوح سے تشبیہ دیتا ہے اور کوئی سیل عرم بتاتا ہے۔ ہو۔ مگر ان دونوں تاریخی واقعات کے ہولناک سین قدامت کے پردے میں چھپ گئے۔ اور اُن کے جگر خراش

مناظر بُد کے دُمند کے میں ہیں - ہیں تو تجھ میں کو وہ سے وی اُس کی شان
نظر آ رہی ہے - اور تیرا سیلاب اُس کے آتشین لاوے کا سیلاب معلوم ہوتا ہے
جس میں ایتالیا کا شہر پومپائی غرق ہو گیا تھا - وہ وی اُس کے آتشین
سیلاب نے پومپائی کو چاروں طرف سے محصور کر لینے کے بعد اندر قدم رکھا
تھا - اُسی طرح تیرے سیلاب نے شہر کی اندرونی آبادی کے بعض محلوں کو
جبکہ لوگ غافل سو رہے تھے ہر چار طرف سے گھیر لیا - اور انہیں ایک خطرناک
جزیرے میں محصور کرنے کے بعد ڈبو یا -

مگر پومپائی کے غریق بحر آتشین آج دو ہزار برس بعد نکل رہے ہیں
اُس سیلاب نے اُنہیں اپنے دامن کے نیچے محفوظ رکھا - جنہیں آج کل
کی زندہ دنیا اگلے عبرت ناک سیلاب کی یادگار سمجھ کے دکھیتی ہے - اور اُنکی
حالت دیکھنے کے لیے لوگ دُور دُور سے سفر کرتے آتے ہیں - مگر موسیٰ ندی !
تو تو بتا کہ ہمارے مُردوں کو کہاں کے تو کہاں لے گئی ؟ اور اُنہیں کہاں
رکھا ہے ؟ کہنے چلنے اور لطف صحبت اُٹھانے کے نہیں تو اُنکی حیرت ناک
صورتمیں دیکھنے ہی کے لیے ہم اُن کا نظارہ کر سکیں - اُنہیں کہیں امانت رکھا
ہے یا سمندر کے قعر میں پھینک آئی ؟ موسیٰ ندی ! موسیٰ ندی ! یہ مَرے نہیں
یہ ہماری امانتیں ہیں جنہیں ہم تجھ سے لین گے - آج نہیں تو کل قیامت کو
لین گے - ایک دن ضرور آنے والا ہے جب لے اڑو ہا صفت ندی تجھے
اپنے یہ لذیذ لقمے اُگلنے پڑیں گے - اور تجھے اپنے اس ظلم و ستم کا یقیناً
جواب دہ ہونا پڑے گا -

آہ ! تیرا غیظ و غضب ! تیرا جوش و خروش ! تیری بے رحمی و سنگدلی !
تیری وہ غضبناک صورت ! تیری وہ مُشکن جبین ! تیری وہ بدحواس
کردینے والی ہیبت ! تو کیا بھی اور ایک دم میں کیا ہو گئی ! تجھے کیا سمجھے
ہوئے تھے اور کیا نکلی ! وہ دیکھو لوگ بدحواس بھاگے جاتے ہیں - لسی کو
اپنے پرانے کا ہوش نہیں - پردے کی بیٹھیے والیاں نئے رنگے پاتون
گھرون سے نکل پڑی ہیں - امین بچن کو بھول آئی ہیں - بیٹے باپون کو

نہیں یاد رہے ہیں۔ بہن بھائی سے چھوٹ گئی ہے اور شوہر جو رو کو چھوڑ آیا
 ہے۔ یہ کہاں بھاگے جاتے ہیں؟ اور اس قدر بدحواس کیوں ہیں؟ ایسے کہ
 کہ موسیٰ ندی اس بھوکے اژدھے کی طرح پیچھے دوڑی آتی ہے۔ وہ سڑکوں پر
 سانپوں کی طرح لہرا لہرا کرے دوڑ رہی ہے کہ کوئی ملے تو اسے ہڑپ کر جائے۔
 گلی کو چون میں رنگ رہی ہے کہ کوئی انسانی شکار ہاتھ آئے تو اسے ہضم کر لے
 گھروں میں گھسستی ہے کہ کوئی تھکا ماندہ رہ گیا ہو تو اسے اپنا نوالہ بنا لے۔
 اپنی تہاں بھوک سے وہ بیتاب ہے۔ چاروں طرف زندہ مخلوق کو ڈھونڈتی
 پھرتی ہے۔ ہزاروں ہنگامہ خد کو نکل گئی اور پیٹ نہیں بھرتا۔ اس کی
 قیامت خیز چال مکانوں کو گرائی اور عالیشان عمارتوں کو ڈھانی جاتی ہے۔
 جدھر جاتی ہے سقراؤ ہو جاتا ہے اور جہاں پہنچتی ہے بالکل صفا یا نظر آتا
 ہے۔ وہ غریب پیمانہ سے جو نہ بھاگ سکے ہیں اور نہ اس ظالم ندی کے پیچھے
 چڑھ سکے ہیں جن مکانوں میں انھوں نے پناہ لی تھی انھیں میں دب دب
 کے اور خود اپنی بنائی ہوئی عمارتوں کے پیچھے پس پس کے جان دے رہے ہیں۔
 مگر یہ تصویر ان مقامات کی ہے جہاں لوگ تیرے چلے سے پہلے چونک
 اٹھے ہیں۔ انھیں تھوڑا بہت بھاگنے کا موقع مل گیا ہے۔ اور اپنے عزیزوں
 کو ڈوبتے اور مکانوں میں دبتے اور یکسی سے جان دینے دیکھتے ہوئے گرتے
 پڑتے بھاگے ہیں۔ لیکن ان جگہوں کی خونی تصویر دیکھی بھی نہیں جاسکتی جہاں
 تو نے اپنا جوش دکھانے سے پہلے ہی لوگوں کو اپنے آغوش مرگ میں گھیر لیا ہے
 وہاں کا عالم! عالم مرگ! عالم تباہی! عالم یکسی و بے بسی! نہ دیکھا جاسکتا
 ہے اور نہ بیان ہو سکتا ہے۔ جنھیں خبر ہو گئی ہے کہ موت سر پر آ پہنچی حسرت
 یا اس سے بھاگے ہیں۔ مگر ہر طرف راستہ بند ہے۔ جدھر جاتے ہیں تیری
 لہریں موت کے فرشتوں کی طرح راستہ روکے کھڑی پھر دے رہی ہیں کہ
 کوئی نکلنے نہ پائے۔ جب سب راستے بند دیکھے تو خدا کے گھر کی طرف
 چلے۔ مسجدوں میں خلقت بھری ہوئی ہے۔ مگر تو نے اس حرم ربانی میں بھی
 قدم رکھا۔ اور ساخت بساعت تیرا ظالم بڑھتا ہی جاتا ہے۔ یہاں تک کہ

تیرا پانی اُبلتے اُبلتے چھتوں سے جا لگا۔ اور وہ سب پناہ گزین خدا ہی کے
گھر میں سے خدا کے پاس سدھار گئے۔ یہ بھی وہ لوگ تھے جنہوں نے کچھ
ہاتھ پاؤں مارے۔ بہت سے تو ایسے ہیں جنہیں خبر بھی نہ ہوتے پانی اور
ان کا بستر عیش ہی بستر مرگ بن گیا۔ آہ کتنے دو لہا دو لہن ہیں جو شب
وفات ہی میں ہم آغوشی سے آغوش موت میں چلے گئے۔ اور اوموسیٰ ندی!
اُنکے چاندی کے پلنگ ہی کو تختہ تابوت بنا کے تو اپنے دوش پر اُٹھالے گئی۔
اور اُن کی روحوں کے ساتھ اُنکے جسموں کو بھی عالم فنا میں پہنچا آئی۔

موسیٰ ندی! تجھے کسی پر تو ترس آیا ہوتا، کوئی تو تیرے دستِ ستم
سے بچا ہوتا۔ عباد کو سب روں میں۔ برہمنوں کو دیر میں۔ طلبا کو مدرسوں
میں۔ صوفیوں کو خانقاہوں میں۔ غرض کسی کو کہیں نہ چھوڑا۔ جو جہاں
تھے وہیں رہے۔ اور تو اُنکے سروں پر جا پونجی۔ میدان شوہروں کے
سامنے۔ بیٹے بیٹیاں ماں باپوں کے سامنے۔ بہن بھائی بہن بھائیوں کے
سامنے۔ دوست دوستوں کے سامنے ڈوب ڈوب کے مر رہے ہیں اور ہی
کو بچانے کی جرات نہیں ہوتی۔ وہ مرتے وقت چاہتے ہیں کہ آخری وصیت
کے دو کلمے اپنے عزیزوں اور دوستوں کے کانوں تک پہنچا دیں۔ مگر نہ وہ
اپنے جان کے خوف سے سُنتا چاہتے ہیں اور نہ تو اپنے غیظ و غضب کے
شور سے سنتے دیتی ہے۔ معصوم بچہ ماں کے آغوش سے نکل کے تیرے
بے رحم آغوش میں چلا گیا ہے اور یہ نجات مان بے بسی سے کلیجہ تھام کے
رہ گئی ہے۔ مہ جبین معشوقہ کو تیری ظالم موجوں نے عاشق کے گلے سے پھرا کے
اپنے گلے لگا لیا ہے اور وہ حسرت سے دیکھ کے رہ گیا ہے۔ ایسے ایسے جگر
خراش منظروں کو دیکھنا اور ترس نہ آنا۔ اے موسیٰ ندی تیرا ہی کام ہے۔

اوموسیٰ ندی! تو اتنی سنگدل! اتنی ظالم۔ اتنی ستم کیش اور اتنی
بے رحم ہے کہ تجھے نہ معصوم بچوں کی معصومی پر ترس آیا اور نہ ہوش دلو باؤں
کی نازنینی پر۔

یہ سب ہنگامہ اور یہ سارا شور محشر حنہ گھنٹوں میں ہو گیا۔ موسیٰ ندی

اپنا جلال و غضب دکھانے چلی گئی۔ عالم پر خوشی اور موت کا سناٹا طاری ہے۔ نہ شرکون کا پتہ ہے نہ گلیوں کا۔ نہ آبادی کا نشان ہے نہ عالیشان عمارتوں کا۔ جدھر نظر جاتی ہے پتھروں کا ڈھیر ہے اور حسرتوں کا اتار۔ ایک عالم ہو ہے۔ اور چند ساعت پہلے کی رونق و عظمت کے آثار۔ امر القیس کہاں ہے یلاؤ اور کہو کہ اپنا قصیدہ سعلقہ بہان کھڑے ہو کے سناؤ۔ اس لیے کہ جو سامان حسرت یہاں نظر آئے گا اُس جگہ مَن نہیں جہاں عزیزہ چند روز کے لیے بس کے چلی گئی تھی؟ گو لڑا سمجھ کہاں ہے؟ اُس سے کہو کہ اس حسرت کہہ میں آ کے اپنی پُرسوز و گداز نظم ”ڈنڈ ٹو لچ“ سناؤ یہاں یادو اثر ہو گا۔ کیونکہ جس اُبڑی سستی کا سامان اُس نے دکھایا ہے ہمارے تباہی زدہ گھروں سے زیادہ تباہ نہیں ہو سکتی۔ اور آخرین حکیم معزی سے کہہ دو کہ اپنے اچھوتے عربی مذاق کے قصیدے کے چند تمہیدی اشارے میں کی دھن میں گا کے ہماری حسرت نصیبی کی داد دے۔

اے ساربان منزل کن جز بردیا ریا مین
رج از دم پر خون کتم اطلال راجھون کتم
تا کی زمان زاری کتم پر بدیع و اطلال مین
خاک و من گلگون کتم از آب چشم خوشین
از روے یار خرگوشی پوان ہی بنیم تھی
آسجا کہ بود آن ولستان و دیوستان بادشا
شد بوم و رویہ راسخان گونگ کمر گس راجھون
برجائے چنگ نائے وئے آواز ز ناع ستون
آہ آہ! ایک جہاز بھی ڈوبتا ہے تو اُس مین ڈوبنے والے پہلے ہاتھ پاؤں مارتے ہیں۔ اور جب قسمت پر زور نہیں چلتا تو اپنے نالہ و شیون کی آواز آسمان تک پہنچا دیتے ہیں۔ مگر ہمارے غریقانِ رحمت ہمارے بے زبان مظلوم کس ببادری۔ کس خوشی۔ اور کس بے بسی سے ڈوبے ہیں نہ کسی کو خبر بھی نہ ہوئی اور وہ چل بسے۔ قافلے کے قافلے عدم کو چلے گئے اور جس کی آواز کسی نے نہ سنی۔

یہ ہے کہ یہ بھی حضرت رب العزت کے جلال کا ایک نمونہ تھا۔ قیامت آگئی تھی۔ خاموش و سہمدم کھڑوں سے آواز آرہی تھی کہ لَئِنْ الْمَلَائِكَةُ لَیْمُونَ؟

اور عالم ہو میں سنا تا اپنی پرہیزگاری اور زمین جواب سے رہا تھا "مَدَالُوَا جِدِّ الْقَهَّارِ"
 ہمارے حیدر آباد کو کنین تصوف کا بڑا زور ہے۔ امرا دارکان دولت
 تک وحدت وجود کے رنگ میں ڈوبے ہوئے ہیں۔ لیکن اسلطنۃ مہاراجہ
 مدارالمہام بہادر دام اقبال اس سرمدی مذہب کے ولادہ اور معرفت کے
 جویا ہیں۔ لہذا خدا کو بھی منظور ہوا کہ نفی اثبات کا جلوہ دکھا دے۔ یہ صرف
 "لا" کا جوش تھا جس نے ایک عالم کو غرق کر دیا۔ اور اب اُس کے بعد اثبات
 ہے۔ جبکہ منتظران ربیعت کیٹی اُچھے کھنڈروں پر ڈیرے ڈالے بڑے میں
 اور اعلیٰ حضرت سکندر صفت کی فیاضی بھوکوں کو کھانا اور ننگوں کو کپڑا
 دینے میں فراخ حوصلگی کے جوہر دکھا رہی ہے۔

سوگواری

کسی دوست یا عزیز کے مرنے پر غلانیہ طور پر وضع و لباس کے ذریعہ سے
 انہما غم کو "سوگواری" کہتے ہیں۔ دنیا کی تمام قوموں کی معاشرت کو دیکھیے
 تو کوئی قوم سوگ منانے سے خالی نہ نظر آئے گی۔ لہذا ہر ملک میں سوگواری
 کی خاص خاص وضعیں اور اُس کے انہما کے خاص طریقے اور رسمیں مروج
 ہیں۔ یون تو جس دن دنیا میں پہلا انسان مرا اسی دن سے رونے اور سوگ
 کرنے کی بنیاد پڑ گئی۔ مگر اس سوگ میں مختلف قوموں نے جو بدترین کین اور
 جیسے جیسے کرتے دکھائے اُن کا بتانا خالی از لطف نہیں ہے۔

سب سے قدیم قوم مصر والوں کی ہے۔ اور انہیں میں سوگواری تمام
 قوموں سے بڑھی ہوئی تھی۔ اس کی زیادتی اور مدت تک قائم رہے گی
 وجہ یہ تھی کہ لاش کی می بنائی جاتی۔ جس کام کے لیے زمانہ درکار ہوتا۔ می
 کے تیار ہوتے تک مرنے والے کے خاندان میں برابر ماتم ہوتا رہتا۔ جب لاش
 می بنانے کے لیے کسی می بنانے والے کے گھر میں لے جانی جاتی اور جب
 تیار می کے بعد وہاں سے لائی جاتی تو رونے اور ماتم کرنے والوں کا اُسے

گروہجوم ہوتا۔ کوئی سن رسیدہ عورت چورونے اور بین کرنے میں زیادہ کمال رکھتی بال کھول کے آتی اور لاش کے سرہانے کھڑی ہو جاتی۔ غم و اہم کی دھن اور دور و بھیری آواز میں اُس کے محاذ و خصال بیان کر کے روتی۔ اور سینہ کوئی کرتی۔ اور ماتم میں تمام لوگ اُس کا ساتھ دیتے۔ اکثر غزون اور امیرون کے مرنے پر سال بھر تک مجلس ماتم بپا رہتی اور کسی وقت روتے چٹنے کا سلسلہ موقوف نہ ہوتا۔

اُنکے بعد اور نیز اُنکے زمانے میں بنی اسرائیل جب ارض موعودہ میں جا کے مقیم ہوئے ہیں تو وہ بھی بڑے جوش و خروش سے اپنے عزیزوں اور دوستوں کا سوگ کیا کرتے۔ اور غالباً اظہار غم کے بھی وہی طریقے تھے جن کو وہ مصر کے قبطیوں سے سیکھ کے آئے تھے۔ اُن کا سوگ یہ تھا کہ گریان چاک کرتے۔ کپڑے بھاڑ ڈالتے۔ بالوں کو نوچتے کھسوتے۔ سینہ کوئی کرتے سر پر خاک ڈالتے۔ نہانا چھوڑ دیتے۔ فرش سے اُٹھ کے زمین پر جا بیٹھتے اور لوگوں میں ننگے سرو ننگے پاؤں پھرتے۔ مرنے والے کے سوگواروں کی یہ حالت سات دن تک رہتی۔ جس مدت کے گزر جانے کے بعد یہ سوگواری کے طریقے موقوف ہو جاتے۔ مگر بنی اسرائیل نے اپنے رسم و رواج کے خلاف حضرت موسیٰ اور جناب ہارون کا سوگ پورے ایک مہینے تک قائم رکھا تھا۔

اب اسکے بعد پرانے یونانیوں کا طریقہ سوگ دیکھیے جو علم و فضل میں سب سے بالاتھے اور اُن کا شہر ایتھنز مدینہ الحکما کہلاتا تھا۔ یونانیوں میں کوئی عزیز و قریب مرنے والا اپنے بال کٹوا دیتے۔ کپڑے بھاڑ ڈالتے۔ سر پر خاک اُڑاتے۔ اور اکثر شہروں میں سیاہ اور ارغوس وغیرہ خاص خاص بستیاں میں سفید کپڑے پہنتے۔ عام مجمع کو چھوڑ کے کسی تنہائی کے مقام میں جا بیٹھتے۔ زمین پر لوٹتے۔ لڑ مہکنیاں کھاتے۔ اور بغیر منہ پر نقاب ڈالنے مجمع عام میں نہ آتے۔

یونانیوں کے بعد رومیوں کا زمانہ آیا۔ وہ تمام باتوں میں ان تک کہ

ہبت سے نہ سہی عقائد میں بھی یونانیوں کے شاگرد تھے۔ چنانچہ اٹلی سوگواری بھی یونانیوں کی سوگواری اور ان کے طریقہ ماتم سے زیادہ متعارف اور جدا نہ تھی۔ ان میں مرنے والے پر رونے اور پیٹنے اور بین کرنے کا زیادہ رواج تھا۔ اور تہنیز و تکفین کے موقعوں پر رونے والے کرائے پر بلوائے جاتے جو صفت باندھ کے کھڑے ہوتے اور رورو کے بین کرتے۔ اسکے سوا ان میں تقریباً وہ تمام باتیں تھیں جو یونانیوں میں تھیں۔

ماتنی لباس کا رنگ بھی قدیم قوموں میں بدلا ہوا تھا۔ اور آج بھی جدا جدا ہے۔ یونانیوں میں بعض جگہ سیاہ تھا اور بعض جگہ سفید۔ رومیوں میں علی العموم سیاہ رنگ ماتنی تھا۔ یورپ میں آج بھی سیاہ ہی رنگ سوگواری کے لیے مخصوص ہے۔ اہل چین و جاپان سوگ میں سفید کپڑے پہنتے ہیں۔ ترکوں میں نیلے یا عباسی رنگ کا رواج ہے۔ ایران میں سیاہ لباس پہنا جاتا ہے۔ مصر میں زرد رنگ سوگواری کا ہے۔ اور حبشیوں میں سوگ اور غم کے موقع پر خاکستری رنگ اختیار کیا جاتا ہے۔

جاہلیت عرب میں بھی مرنے والے کی نسبت پر بڑے زور و شور کا ماتم ہوتا تھا۔ عورتیں گریبان چاک کرتیں۔ روتھیں پیٹتیں۔ اور مرثیوں اور بین کے نقروں کے ساتھ علی العموم نوحہ خوانی کرتیں اور سر و سینہ پیٹتیں۔ بیان تک کہ اسلام ظاہر ہوا۔ اور تعلیمات ربانی سے انسانی اخلاق کی اصلاح ہو جتے لگی۔

اسلام نے سوا آنسو بہانے اور سادگی و تہذیب کے ساتھ رنج و الم کرنے کے سر و سینہ پیٹنے چلا چلا کے بین کرنے۔ زیب و زینت چھوڑنے اور ماتنی لباس پہننے کو حرام بنایا۔ چنانچہ نور اسلام کے نمایان ہوتے ہی سوگواری اور سینہ زنی عرب میں بیکلم ترک ہو گئی تھی۔

حضرت امام حسین علیہ السلام کے شہید ہونے کے بعد عزا داران حسین نے سوگواری و عزا داری کو جزو دین بنا دیا۔ اور ان کے جوش رنج و الم نے تھوڑی ہی مدت میں سوگواری کو اس قدر اہم اور باقاعدہ بنا دیا کہ شاید

محبان حسین سے زیادہ جوش عزاداری دنیا کی کوئی قوم نہ دکھا سکی ہوگی۔
اس اسلامی سوگداری کی شان دیکھنے کا جسے شوق ہو محرم میں لکھنؤ کی سیر
کمرے اور دیکھے کہ یہ دینی سوگداری دیگر اقوام و ملل کی سوگداریوں سے کس قدر
بڑھی چڑھی ہے۔

یہاں محرم کے شروع ہوتے ہی عزاداران حسین کا لباس سیاہ۔ بٹلا
یا سبز ہو جاتا ہے۔ عورتیں چوڑیاں اور تمام زیور بڑھادیتی ہیں۔ اور
اُس کے عوض ہاتھوں میں سیاہ یا سبز ریشمی پہنچیاں اور کانوں میں سیاہ
و سبز ریشمی پھول پہن لیے جاتے ہیں۔ بال کھول دیے جاتے ہیں۔ اور
خاص نما شورے کے روز بھوسا اور خاک اڑا کے سر پر ڈالا جاتا ہے۔ پان
کھاتا مرد و عورت سب چھوڑ دیتے ہیں۔ اور پانوں کے عوض گونا گوا یا جاتا
ہے۔ تعزیموں کے جلوس عزاداری کا ایک مکمل ترین نمونہ ہوتے ہیں۔ اور
محاسن عزائم بتوتے ہیں کہ غم منانے میں ہم دنیا کی قوموں سے کس قدر
بڑھ گئے ہیں۔



نامور مصنفین کی مقبول تصنیفات

یعنی مولوی محمد حسین صاحب آزاد، علامہ شبلی نعمانی، مولوی نذیر احمد صاحب دہلوی، سرسید احمد رضا، مولانا حالی، بی بی نوائے الحکام
میراں شہید، غلام الرشید مولوی نذیر احمد صاحب، مصوٰغہ علامہ اشرف الخیری، مصوٰغہ فطرت، اجڑن نظامی، حکیم محمد علی صاحب
تمیز رشید، جانشین سعید، علامہ شبلی نعمانی مولوی سید ایمان صاحب دی، ادیب زمانہ، مؤرخ گیارہ مولانا مولوی محمد عبدالحکیم صاحب
نظامی، عالی وغیرہ قابل تصنیفین، مانہ حال، ماضی کی تصنیفات، تالیفات جاری، مکان سے طلب کی جاسکتی ہیں، قیمت
قیمت دانہ فٹانہ پانچ روپیہ بی بی تعیسیٰ ارشاد ہوگی، اگر کوئی کتاب خزانہ سے موجود نہ ہو تو حتیٰ الوسع تلاش
کے کہ ہم پہنچا دی جائیگی، ختم ہوگئی ہوگی تو مجبوراً ہی ہے، نیز دنیائے ادب و اخلاق کی مشین یعنی مرزا سلطان احمد صاحب
ریٹائرڈ اسسٹنٹ کمشنر کی مجلہ تصانیف بھی ہم سے طلب فرمائیں، خان احمد حسین خان صاحب حقیفہ ڈیڑھ مشہور مقبول
شباب اردو کی نظمیں اور اخلاقی ناول سراغ رسانی کے ناول بھی ہم سے مل سکتے ہیں۔

جلد دہ گلداز بابت ۱۸۸۹ء جو اردو ادب اور انشا پر ازی کی جان میں جن سے جن صاحبوں نے فائدہ
اٹھایا وہ اس جگہ کے مشہور مصنف اور مولف دیب بن گئے جن کی سطروں کا معاوضہ بلا مبالغہ نوٹ ہوتے ہیں، اگر جلدی
ان جلدوں کو طلب کر لیا گیا تو پہلے کی طرح پھر یہی قیمت پر بھی نہ مل سکیں گی کیونکہ بہت تھوڑی تعداد میں جمع ہوئی
ہیں نیز شاعرانہ و عاشقانہ مضامین جو ملنا کے دگلداز میں آج تک نکلتے رہے ہیں مولانا موصوف کی ترمیم اضافہ سے
طبع ہو رہے ہیں جو مختصر بابت اشارہ تعالیٰ تیار ہو جائیں گے شائقین ادب و لادگان اگرچہ پہلے ہی شے
دعوتیں دانہ فرمائیں تو نایابی کے اندیشہ سے محفوظ رہیں گے، فہرست کتب بغیر ایک آنے کے ٹکٹ آئے دانہ نہ ہوگی
المکتبہ

عبدالرشید نیدرادر جبران کتب لوباری ازہ ہوا
کتبہ خوش قلم لاہوری